صبوحی۔ مرتبہ جناب مہر چند کوثر صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ہے/ ۵۰ پیسے، پتہ: پنجاب اردو اکاڈمی، 3349-D-21 چنڈی گڑھ۔

(۲) نونہال صابرہ۔ مزید آشرم۔ راگھو مزرعہ پٹیالہ۔

جناب مہر چند کوثر پنجاب کے خوشگو شاعر ہیں، گو انکی شاعری کی عمر طویل نہیں ہے، لیکن انکے کلام میں پختگی اور شستگی پائی جاتی ہے، شاعر کو اصلی مناسبت غزل سے ہے، چنانچہ اس مجموعہ کا بیشتر حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے انکے تغزل میں رنگینی و لطافت، معنی آفرینی اور طرز ادا کی دلکشی نمایاں ہے، ان کے درد مند دل نے حسن و عشق کے معاملات میں زندگی کے مسائل و حقائق کی جھلک اور غم عشق میں آلام روزگار کی تلخیاں بھی شامل کر دی ہیں، اس طرح ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کی شان پیدا ہوگئی ہے، آخر میں بعض قومی و ہنگامی مسائل پر چند نظمیں ہیں، ان سے بھی مصنف کی قادر الکلامی اور ملک و وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں مقبول ہوگا۔

سوئٹ سفارتخانے میں۔ مترجمہ جناب مخمور سعیدی، پریم گوپال متل صاحبان، و سعیدہ انجم صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۶، قیمت عہ/ ناشر نیشنل اکاڈمی ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ دہلی ۶۔

نیشنل اکاڈمی دہلی نے کمیونزم کے اصلی خد و خال کو دکھانے کیلئے متعدد مفید کتابیں شائع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک دلچسپ کڑی ہے، جو بریامین تیتین ایک روسی ڈپلومیٹ اور سوئٹ نمایندے الیکزنڈر کزناچیف کے ان تجربات پر مشتمل ہے جو ان کو وہاں کے روسی سفارت خانے کے اندر اور باہر پیش آئے، مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک طرف تو سوئٹ محکمہ سفارت بری حکومت سے دوستانہ معاہدے اور خوشگوار معاملات طے کرتا ہے، دوسری طرف اسکا خفیہ جاسوسی ادارہ کمیونسٹوں کو منظم کرنے، ملک میں بغاوت اور انارکی پھیلانے اور حکومت کو ختم کرنے کی پراسرار سازشیں کرتا رہتا ہے اور ان تخریبی کارروائیوں کا ذمہ دار وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کو قرار دیدیا جاتا ہے، ممکن ہے مصنف کے بعض بیانات میں مبالغہ ہو لیکن مجموعی حیثیت سے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے سوئٹ یونین کی کمیونزم کو پھیلانے کی خفیہ اور منظم جدوجہد کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور برما کے بعض معاشرتی حالات اور مشہور تاریخی یادگاروں کے متعلق معلومات بھی فراہم ہوتے ہیں۔

"ض"

نمبر ۱۰۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

ہندوؤں کا مقدس شہر بنارس مسلمانوں کے لیے بھی بعض حیثیتوں سے پرکشش رہا ہے، شیخ علی حزیں اس کے اس قدر شیفتہ تھے کہ یہاں سے نکلنا پسند نہ کرتے تھے، اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

اور آج بھی ان کی لوح مزار کے یہ اشعار بنارس سے ان کی وابستگی کی یاد دلاتے ہیں:

زبان دان محبت بودہ ام دیگر نمیدانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا
حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسایش رسید اینجا

بنارس میں اسلامی عہد کے بہت سے تاریخی آثار ہیں، اس کی خاک سے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، حافظ امان اللہ بنارسی المتوفی ۱۳۲۲ھ اپنے دور کے نامور عالم تھے، اور ان کی ذات طالبان علم کا مرجع تھی، ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ جیسے علما ان کے شاگرد تھے، بنارس کی یہ خصوصیت اب بھی قائم ہے، اور وہ اس زمانہ میں بھی دینی تعلیم کا ایک بڑا مرکز ہے، یہاں عربی کے متعدد بڑے مدرسے ہیں، ان میں سے دو کو گذشتہ مہینہ دیکھنے کا موقع ملا، مظہر العلوم اور اہلحدیث کا مرکزی دار العلوم، یہ دونوں احناف اور اہل حدیث کے مرکزی مدرسے ہیں، مظہر العلوم کے ناظم بنارس کے ایک مخلص، دیندار اور مخیر تاجر حاجی عبد العزیز صاحب ہیں، ان میں دینی کاموں کی بڑی لگن ہے، اور اس میں وہ اپنی دولت کا معتد بہ حصہ صرف کرتے ہیں، مظہر العلوم کے علاوہ ایک ہائر سکنڈری اسکول، ایک مدرسۂ نسواں، ایک یتیم خانہ انکی نگرانی میں چل رہا ہے، اسپتال کی عمارت ابھی بنکر تیار ہوئی ہے، اس کا افتتاح باقی ہے، ان سب کی عمارتیں نہایت وسیع اور شاندار ہیں، ان کاموں میں مولانا محمد اسحٰق صاحب ندوی حاجی صاحب کے دست راست ہیں،

اہلحدیث کا مرکزی دار العلوم حال میں قائم ہوا ہے، گذشتہ اکتوبر میں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر اسکی رسم افتتاح ادا ہوئی تھی، دمشق، حجاز اور کویت تک کے علما اس میں شرکت کیلئے آئے تھے، ابھی اسکے سامنے کے رخ کی دو منزلہ عمارت بنی ہے، دار الحدیث زیر تعمیر ہے، ان سے اس دار العلوم کی عظمت و شان کا اندازہ ہوتا ہے، اسکے ناظم مولانا عبد الوحید صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم اور دولت دنیا دونوں سے نوازا ہے، ابھی نوجوان ہیں اور دار العلوم کا کام بڑی دلسوزی سے انجام دیتے ہیں، یہ جمعہ کا دن تھا، مدرسوں میں تعطیل تھی، وقت بھی کم تھا، اسلیے صرف ان کی عمارتیں دیکھ سکا، اور بعض اساتذہ اور منتظمین سے سرسری ملاقات ہو سکی تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، ان مدارس کا لاکھوں روپئے سالانہ کا خرچ ہے، جس کو بنارس کے مخیر تاجر فراہم کرتے ہیں، باہر سے امداد کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کے مذہب، کلچر اور زبان کے تحفظ کا بڑا شور ہے، انکی حفاظت کا کام یہی مدارس انجام دے رہے ہیں، اور انہی کے بدولت ان کا نام باقی ہے۔

بنارس کی انجمن ترقی اردو کو بھی دیکھنے اور اسکے کارکنوں سے ملاقات کا موقع ملا، انکے کاموں سے اخبارات کے ذریعہ کچھ واقفیت تھی، اسکی تفصیل سنکر بڑی حیرت ہوئی، اردو والوں کی اشک شوئی کے لیے اور دوسری زبانوں کے طفیل میں اردو کو جو سہولتیں ملی ہیں ان میں ماتحت عملہ اتنی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے کہ ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، اس انجمن کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے ان سہولتوں کے متعلق سرکاری احکام کو جنھیں عملے والے

دبائے بیٹھے تھے، حاصل کرکے ان کا نفاذ کرایا اور جہاں اس میں دشواری پیش آئی وہاں نقدمات دائر کرکے عدالتوں کے ذریعہ اردو کے حقوق حاصل کیے، چنانچہ اس وقت بنارس کے بہت سے اسکولوں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے اور عدالتوں اور رجسٹری آفس وغیرہ میں بھی اردو میں درخواستیں دینے کی اجازت ہے، جس سے خود اردو والے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں، انجمن کا ایک کتبخانہ بھی ہے جس میں اردو اور ہندی کی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، انجمن کے روح رواں داتا رسول صاحب اور بابو شیو نرائن ہیں جن کی اردو دستی سے اردو کے اصحاب واقف ہیں، انہی بابو صاحب نے کہا کہ اردو کے معاملہ میں "پاسباں مل گیا کعبہ کو صنم خانے سے"۔ مسلمانوں کے دینی و ملی کاموں میں مولوی احمد مکرم صاحب ولیہ پوری بھی پیش پیش رہتے ہیں۔

اردو کے بارہ میں حکومت کی پالیسی کھلی ہوئی ہے، اس سے توقع رکھنا عبث ہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ خود اردو کے بہت سے ہمدرد و ہواخواہ اس کی بقا و تحفظ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے، اس میں سب سے زیادہ شکایت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں سے ہے، وہ نجی کی صحبتوں میں تو اردو کشی کا رونا روتے ہیں لیکن انکو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی، ہندو ممبر تو کبھی کبھی اردو کی حمایت میں آواز بھی بلند کر دیتے ہیں، مسلمان ممبروں سے اتنا بھی نہیں ہوتا، اگر وہ متحدہ آواز بلند کریں تو اردو کے بہت سے حقوق مل جائیں، بیشتر مسلمان والدین مستقبل کی موہوم امیدوں اور خیالی خطرات کی بنا پر اپنے لڑکوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلاتے، دوسرے شعبوں میں بھی اردو سے بے اعتنائی کا یہی حال ہے، ایسی حالت میں محض حکومت کی شکایت بے نتیجہ ہے، یہ کام بھی ایک دینی جماعت، دینی تعلیمی کونسل انجام دے رہی ہے، کم سے کم مسلمانوں کو اس میں تو اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے، اردو زبان اور مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ مسلمانوں کی ملی موت و حیات کا مسئلہ ہے، اگر اس سے انھوں نے غفلت برتی تو انکی آئندہ نسلیں صرف نام کی مسلمان رہ جائیں گی۔

مقالات

اُردُو زَبان کا ترکی عنصر

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(۲)

باوُرچی ۔ باورچی تاتاری زبان کا لفظ ہے، جو طباخ یعنی خانساماں کے معنی میں اردو میں بکثرت مستعمل ہے، اردو میں یہ لفظ غالباً براہ راست آیا ہے،

ترکی میں باورچی کو آشچی کہتے ہیں، آش بمعنی خوراک یا کھانا اور چی نسبتی ہے، فارسی میں اسے آشپز کہتے ہیں،

اکثر لغت نگاروں نے باورچی کے اصل ماخذ اور اشتقاق کے بارے میں کوئی کارآمد بات نہیں کہی اور جو کچھ لکھا ہے غلط سلط لکھا ہے۔ مثلاً مؤید الفضلاء کے مصنف نے اسے غلطی سے فارسی الفاظ کی فصل میں مندرج کیا ہے، جامع اللغاتِ اردو کے مؤلف نے اسے ہندی بتایا ہے جو قطعاً غلط ہے، پلاٹس کے نزدیک باورچی فارسی بھی ہے اور ترکی بھی، کیونکہ اس لفظ کے ساتھ انھوں نے فارسی اور ترکی دونوں زبانوں کی علامتیں ڈال دی ہیں، یعنی وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ لفظ فارسی ہے یا ترکی، لیکن اس شک کے باوجود انھوں نے اسے 'باور' سے مشتق بتایا ہے، اور اس اندراج سے اوروں کو بھی گمراہ کیا ہے، شٹائنگس صاحب نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ اس کے اشتقاق اور ماخذ کے

بارے میں خاموشی اختیار کریں۔

تاتاری امرا کے ہاں باورچی معمولی حیثیت کا ملازم نہیں ہوتا تھا، بلکہ خاصی اہمیت کا مالک ہوا کرتا تھا، اور باورچی کے عہدہ پر بالعموم اعلیٰ طبقہ کے قابلِ اعتماد لوگ مقرر کیے جاتے تھے، باورچی نہ صرف امیر کے کھانے کی تیاری کا انتظام کرتا تھا، بلکہ تیاری کے بعد اس کا جائزہ بھی لیتا تھا، اور کھانے کے وقت دسترخوان پر بذاتِ خود موجود رہتا تھا، اور اپنے آقا کی جملہ ضروریات پر نگاہ رکھتا تھا، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں ترکی اور تاتاری امراء کے دسترخوان کی جو کیفیت لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک امیر کا ایک الگ باورچی ہوتا تھا، جو صاف ستھرے ریشمی کپڑے پہنے اور ہاتھ میں تولیے دسترخوان پر اپنے آقا کے سامنے موجود رہتا تھا، اور بوقت ضرورت چھری سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ہڈیوں سے جدا کر کے امیر کے سامنے پیش کرتا تھا، اور اس کام میں بڑی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیتا تھا، (دیکھو رحلۃ ابن بطوطہ مطبوعہ پیرس جلد دوم صفحہ ۴۰۰)

بیگ۔ بیگ ترکی لفظ ہے، جس کے معنی کسی قوم یا قبیلہ کے سردار کے ہیں، اس لیے عربی میں بیگ کا ترجمہ امیر کرتے ہیں، بیگ کا مرتبہ خان اور خاقان کے مقابلہ میں کمتر ہے،

ترکی قواعد زبان کی رو سے بیگ کا مؤنث بیگم اور جمع بیگلر ہے، بیگلر بیگی سے مراد امیر الامراء، آجکل عثمانی ترک بیگ کو بک لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ بے کرتے ہیں، مثلاً انور بک (Enver Bey)

ہندوستان کے اسلامی دور میں بیگم کا لقب شاہی خاندان کی خواتین کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور اس کی جمع بیگمات کرتے تھے، جیسے بیگمات اودھ۔ آجکل ہندوستان اور پاکستان کے تعلیم یافتہ شرفاء میں بیگم انگریزی لفظ مسز (Mrs) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

بہادُر۔ بہادر تاتاری اور ترکی زبانوں کا ایک مشترک اور کثیر الاستعمال لفظ ہے، جس کا معنی شجاع اور دلاور ہے، تاتاریوں کے ہاں یہ لفظ باتور اور بغاتور کی صورت میں بھی پایا جاتا ہے، اور آس پاس کی بہت سی زبانوں میں دخیل ہو چکا ہے،

بہادر کا لفظ فارسی اور اردو میں داخل ہو کر ان زبانوں کا جزء لاینفک بن چکا ہے اور اسم علم، اسم صفت اور لقب ہر طرح سے بکثرت مستعمل ہے، مثلاً بہادر خان، بہادر شاہ اور خان بہادر وغیرہ۔

تِمُر یا تیمُور۔ تمر یا تیمور ترکی لفظ ہے، جس کا لغوی معنی لوہا ہے، تیمور اسم علم کے طور پر بھی مستعمل ہے، جیسے امیر تیمور گورگان۔

جیسا کہ ترکی الفاظ کے بارے میں دستور ہے، اگر تمر کی حرکات کو بذریعہ حروف ظاہر کیا جائے تو اسے تیمور کی صورت میں لکھتے ہیں، مصری لوگ اس کا تلفظ تَیمور (بالفتحہ) کرتے ہیں، جو درست نہیں، کیونکہ اس کا ابتدائی حرف مکسور ہے۔

جرگہ۔ تاتاری زبان کا لفظ ہے، جس کا بنیادی لغوی معنی حلقہ ہے، جرگہ قبیلہ کے افراد کا وہ حلقہ یا مجمع ہے، جو مشاورت کے لیے یا کسی اہم بات پر غور کرنے کے لیے جمع ہو۔

پھر جرگہ سے مراد وہ حلقہ بھی لیتے ہیں جو فوجی یا لشکری دشمن کو محصور کرنے یا شکاری جانور کو گھیرنے کے لیے بناتے ہیں،

جرگہ کا لفظ فارسی پشتو اور اردو زبانوں میں بھی مروج ہو چکا ہے، اور کم و بیش ان ہی معنوں میں مستعمل ہے۔

پلاؤ۔ ترک اس کا تلفظ ابتدائی کسرہ کے ساتھ پِلاو کرتے ہیں، لیکن اردو داں طبقہ میں اس کا عام مروجہ تلفظ (ضمہ کے ساتھ) پُلاؤ ہے۔

پلاؤ وہ طعام یا کھانا ہے، جو چاولوں کو گوشت کی یخنی میں پکا کر تیار کیا جاتا ہے، اور ترکوں اور دوسری مسلمان قوموں کا مخصوص اور مرغوب کھانا ہے۔ ترکوں کے ہاں پلاؤ کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً باش پلاؤ وہ پلاؤ ہے جو بکرے کی سری ڈال کر تیار کرتے ہیں، بالق پلاؤ وہ پلاؤ ہے جس میں گوشت کے بجائے مچھلی ڈالی جائے، طاوق پلاوی جو مرغ کے چوزے کے گوشت کے ساتھ تیار کیا جائے، عجم پلاوی یا قیمہ لو پلاوی وہ پلاؤ ہے جو قیمہ کے ساتھ کھایا جائے، اور مولوی پلاوی وہ پلاؤ ہے جو صرف گھی اور پیاز ڈال کر پکایا جائے،

ہندوستان میں بھی پلاؤ کی چند قسمیں مروج ہیں، مثلاً "مرغ پلاؤ" یا "مٹر پلاؤ"۔ مٹر پلاؤ وہ چاول ہیں جو گوشت کے بجائے سبز مٹر ڈال کر پکائے جائیں، لیکن اس پلاؤ کا مصنوعی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ حقیقی پلاؤ وہ ہے جو گوشت کی یخنی میں تیار کیا جائے۔ پلاؤ کا لفظ اردو کے بعض محاورات میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً "خیالی پلاؤ پکانا" یعنی ہوائی قلعے بنانا، خیالی تجویزوں یا منصوبوں سے دل بہلانا۔

چونکہ پلاؤ مشرقی ملکوں کا ایک مشہور اور مقبول کھانا ہے، جس کا مشرقی زندگی کے سلسلے میں مغربی کتابوں میں بھی اکثر ذکر آیا ہے، اس لیے پلاؤ کا لفظ انگریزی زبان کی اکثر لغات میں Pilau یا Pilaw یا Pilaff کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مؤلفین نے سراغ لگایا ہے کہ انگریزی مطبوعہ لٹریچر میں اس کا استعمال سب سے پہلے ۱۶۱۲ء میں ہوا تھا، لیکن ان لغات میں اس کے ماخذ کو فارسی بتایا گیا ہے، جو صریحاً غلط ہے، دوسری اسلامی قوموں کی طرح اگرچہ ایرانی بھی پلاؤ کے بہت شائق ہیں، لیکن یہ لفظ بذات خود ترکی ہے، ایک ایرانی شاعر نے پلاؤ کی تعریف میں کہا ہے:

ہیچ نعمت نمی رسد بہ پلاؤ   ہیچ شربت نمی رسد بہ شکر

پلاؤ کی تمدنی اور لسانی اہمیت اور دلچسپی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے گیارہویں اڈیشن (مطبوعہ کیمبرج) میں اس کے متعلق مختصر سا آرٹیکل ذیل Pilau موجود ہے۔

جامع اللغات (اردو، مطبوعہ لاہور) کے مؤلف خواجہ عبدالمجید صاحب نے پلاؤ کو اصلاً ہندی بتایا ہے، اور اس بارے میں غالباً پلاٹس کو اپنا پیر و مرشد بنایا ہے، لیکن جہاں تک علم اشتقاق (Etymology) کا تعلق ہے، خواجہ صاحب موصوف لغت نویسی کے میدان کے حاطب اللیل ہیں، میں ان کی ہفوات کا کہاں تک ذکر کروں، ہندی اللسان لوگوں کا من بھاتا کھاجا تو "دال بھات" ہے، ان کی زبان کو، جو بالعموم قومی تمدن اور ملکی معاشرت کی عکاسی کرتی ہے، پلاؤ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، جو گوشت سے تیار ہوتا ہے۔

جوق۔ اردو میں جوق کا لفظ کثرت اور بہتات کے معنے میں آتا ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ لوگ میلے یا جلسہ میں جوق جوق آئے، یعنی کثرت سے آئے، ٹھٹھ کے ٹھٹھ آئے۔

جوق در اصل ترکی لفظ چوق ہے، جو کثرت اور بہتات کے مفہوم کو ادا کرتا ہے، گویا اردو لفظ "بہت" کا مترادف اور ہم معنی ہے، مثلاً ترکی میں کہتے ہیں چوق گوزل یعنی "بہت خوب، بہت خوبرو"۔ "چوق یاشا" مدت تک زندہ رہے، یعنی زندہ باد۔ اسی طرح "چوق چوق" کا doublet بھی مستعمل ہے جس کا معنی ہے 'بہت کثرت سے'، بہتات کے ساتھ، اور یہی وہ کلمہ ہے جو اردو میں "جوق جوق" کی صورت میں مستعمل ہے، اس سے ہمارے اکثر لغت نویسوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جوق کا معنی گروہ ہے، لیکن چوق در اصل ترکی میں اسم نہیں بلکہ ایک قسم کا حرف ظرف (adverb) ہے، جیسا کہ مذکورۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہے۔

چوق کا لفظ عربی زبان میں بھی جوق کی صورت میں دخیل ہو چکا ہے، اور اس سے بالعموم گروہ یا جماعت یا بھیڑ مراد لیتے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ ہمارے اردو لغت نگاروں کے

اندراجات بھی عربی کے اس استعمال سے متاثر ہوئے ہیں، عربوں نے جوق کو ایک سہ حرفی مادہ قرار دے کر اس سے بعض افعال بھی مشتق کر لیے ہیں، یہ لفظ عربی لغت کی قدیم کتابوں میں نہیں تھا، بلکہ عہد حاضر کے لغت نویسوں مثلاً ورتبات اور سپیر وبک نے اپنی لغات میں اس کا اندراج کیا ہے۔

چُغلی۔ غمازی کرنا، کسی کی غیر حاضری میں اس کی برائی یا شکایت کرنا، چغلی ترکی لفظ چوغولی ہے، جو چوغول سے ماخوذ ہے، چوغول وہ مخبر ہے جو پولیس یا دیگر حکام کو کسی کے متعلق خبر رسانی کرتا ہے، لہٰذا چوغولی یا چغلی در اصل وہ خبر یا اطلاع ہے جو کوئی مخبر حکام بالا کو پہنچائے۔

چی۔ چی ترکی زبان کا ایک نہایت مفید اور کثیر الوقوع لاحقہ (× نمر/ لاحقہ) ہے جو کسی چیز کے ساتھ نسبت ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے، اس حرف کے اضافہ سے جو الفاظ وضع ہوئے ہیں، اُن میں پیشہ وروں کے نام بھی شامل ہیں، مثلاً طوپچی (توپچی)، قپوچی (دربان) باورچی، کباچی، تیمورچی (لوہار)، سودچی (شیر فروش) چیچکچی (گلفروش)

چی کا صرف بعض ایسے الفاظ کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے جو ترکی نہیں بلکہ عربی یا فارسی ہیں، مثلاً خزانچی، مشعلچی، بستانچی (باغبان)، حلواچی (حلوائی)، میوہ چی (میوہ فروش) اجزاخانچی (عطار، دوا فروش)، قانونچی (سلطان سلیمان اعظم کا لقب)

اجزاخانچی کا لفظ اس لحاظ سے نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے کہ وہ تین مختلف اسلامی زبانوں کے الفاظ سے مل کر بنا ہے، اس کے تین اجزائے ترکیبی میں سے پہلا جزو یعنی اجزا (بمعنی ادویہ) عربی ہے، دوسرا جزو خانہ فارسی ہے، اور تیسرا جزو چی ترکی ہے، گویا یہ لفظ تین مختلف اسلامی قوموں کے باہمی تمدنی اور ثقافتی اختلاط و ارتباط کا آئینہ دار ہے اور اس اسلامی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا ہے جس کے فروغ اور ارتقا میں عربوں،

ایرانیوں اور ترکوں تینوں قوموں نے مل کر اپنی اپنی بساط اور صلاحیتوں کے مطابق حصہ لیا ہے۔

چی کا لاحقہ بعض اردو اور ہندی الفاظ کے ساتھ بھی آیا ہے، مثلاً ڈنکچی، ڈھنڈورچی وغیرہ۔

خان۔ خان ترکی اور تاتاری قوموں کا ایک قدیم لفظ ہے اور ان کے ہاں ایک اعلیٰ اور ارفع لقب ہے جو کسی زمانہ میں صرف حکمرانوں، سلطانوں اور عالی مرتبہ امیروں کے لیے استعمال ہوتا تھا، مثلاً چنگیز خان، ہلاکو خان، عثمان خان، اُور خان وغیرہ۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ خان کا لفظ قاغان یا قاآن کی مخفف صورت ہے جو تاتاریوں کے حاکم اعلیٰ کا لقب تھا۔

ترکی قواعد زبان کی رو سے خان کا مؤنث خانم اور جمع خانلر ہے، ہمارے ہاں خان کی جمع خوانین رائج ہے، مگر یہ عربی قواعد کے مطابق بنائی گئی ہے۔

انگریزوں نے خان سے ایک لفظ Khanate بنالیا ہے جس سے وہ ریاست یا مملکت مراد لیتے ہیں، جو کسی خان کے زیر حکومت ہو، مثلاً The Khanate
The Khanate of Crimea and of Khiva

پلاٹس نے لفظ خان کو غلط طور پر فارسی بتایا ہے اور اس کے ڈانڈے پہلوی، زند اور سنسکرت کے بعض ایسے الفاظ سے ملانے کی عبث کوشش کی ہے، جن کا خان کے ساتھ لسانی، ادبی، تاریخی یا ثقافتی لحاظ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، صاحب ممدوح نے اس بارے میں جو زحمت اٹھائی ہے وہ نہ صرف عبث اور بیکار ہے، بلکہ علمی اعتبار سے بھی ناقابل قبول اور بعید تعجب انگیز ہے،

دیگر القاب اور تعظیمی کلمات کی طرح خان کا لفظ بھی بیحد مبتذل ہو چکا ہے، چنانچہ افغانستان پاکستان اور ہندوستان وغیرہ ملکوں میں لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو خان کا لفظ بطور لقب کے یا نام کے جزو کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ ان کا ترکوں یا تاتاریوں سے ساتھ، جن کی زبان کا یہ لفظ

نسلی یا لسانی یا ثقافتی اعتبار سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا،

خاقان تاتاریوں کے خان اعظم یعنی حاکم اعلیٰ کا لقب ہے، جو عربی مصنفین کے ہاں مروج ہے۔ خاقان قاغان کی بگڑی ہوئی صورت ہے، مگر عربی اور فارسی تواریخ میں اس لقب کی یہی صورت مستعمل ہے۔

قاغان کی ایک اور مخفف شکل قاآن بھی ہے، چنانچہ الخانیوں کے وزیر رشید الدین فضل اللہ نے اپنی جامع التواریخ میں تاتاریوں کے خان اعظم کے لیے قاآن ہی کا لقب استعمال کیا ہے۔

داروغہ ۔ داروغہ تاتاری زبان کا لفظ ہے، بمعنی گورنر یا حاکم شہر۔

داروغہ تاتاریوں کے ہاں ایک اعلیٰ منصب ہوا کرتا تھا جس کا ذکر سب سے پہلے الخانی عہد میں ملتا ہے۔ بعد ازاں تیموری دور میں داروغہ نے شحنہ یعنی کوتوالِ شہر کی جگہ لے لی جس کے فرائض ایک اعلیٰ پولیس افسر کی مانند ہوتے تھے، مثلاً وہ دنگہ فساد، شراب خوری اور بدمستی اور قماربازی وغیرہ جرائم کی روک تھام کرتا تھا، اور مجرموں کو سزا دیتا تھا۔

ابوالفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے عہد میں داروغہ شاہی اصطبل کا انتظام کرتا تھا۔

دیگر مشرقی القاب و مناصب کی طرح لفظ داروغہ بھی اب مبتذل ہو چکا ہے، چنانچہ پنجاب کے بعض شہروں میں داروغہ سینیٹری انسپکٹر کو کہتے ہیں، جو خاکروبوں کے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

قرا یا قرہ ترکی ہے بمعنی سیاہ۔

آق (سفید) کی طرح قرا کا لفظ بھی کئی مرکبات میں آیا ہے، مثلاً

قراخاں یعنی کالے خاں۔

قرہ طاغ یا قرہ داغ یعنی جبل اسود، مونٹی نیگرو (Montenegro)۔

قرہ دِکز یعنی بحیرۂ اسود

قرہ قلپاق ۔ ایک قبیلہ ہے

قرہ قویونلی ۔ ترکی قبائل جن کا نشان سیاہ بھیڑ تھا۔

قراقُل ، ایک قسم کی بھیڑ جس کی کھال سے ٹوپی یا کلاہ بناتے ہیں جو قراقُلی کہلاتی ہے۔

قزلباش ۔ ایران کے صفوی خاندان کے ایک مورث اور شاہ اسمٰعیل کے والد شیخ حیدر متوفی ۸۹۳ھ کے ترکمانی مریدوں کا لقب ہے۔

قزلباش ایک ترکی کلمہ ہے، جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، قزل بمعنی سرخ اور باش بمعنی سر، اسی لیے فارسی میں ان کو "سرخ سر" یعنی سرخپوش کہتے ہیں۔

قزلباش کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شیخ حیدر مذکور نے اپنے مریدوں کو حکم دیا تھا کہ وہ طاقیہ ترکمانی کو چھوڑ کر اپنی علامت خاص کے طور پر سرخ رنگ کی کلاہ اختیار کریں۔ ان ترکمانی مریدوں کی زبان ترکی تھی، اس لیے وہ قزلباش (یعنی سرخ سر) کے نام سے مشہور ہوئے اور یہ نام اُن کا امتیازی لقب بن گیا۔

ہندوستان اور پاکستان میں بعض لوگ ابتک قزلباش کہلاتے ہیں اور شیعی مذہب رکھتے ہیں،

قلماقنی ۔ قلموق قوم یا قبیلہ کی عورت۔

قلماقنی قلموق کا اسم مؤنث ہے، جو ہندی قواعد زبان کے مطابق بنایا گیا ہے،

قلموق تاتاری نسل کے لوگ ہیں، جو پہلے کوہستانِ التائی کے قرب وجوار میں رہتے تھے، اور اب بھی منغولستان (منگولیا) کے علاوہ دریائے والگا کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں، اس قوم کی عورتیں شاہانِ مغلیہ کے محلات میں پہرہ داروں کی حیثیت سے حفاظت و حراست پر مامور ہوا کرتی تھیں،

کشکول. کشکول ترکی کلمہ کچکول کا معرب ہے، اور کچکول وہ کشتی نما کاسہ ہے جس میں درویش یا گداگر یا گدڑیے رنگارنگ کے متفرق کھانے جمع کر لیتے ہیں، اسی مناسبت سے عربی میں کشکول کا لفظ ایسے متعدد مجموعوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جس میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے انواع واقسام کے مضامین جمع کر دیے گئے ہیں، مثلاً محمد بن حسین بہاء الدین عاملی (متوفی ۱۰۳۱ھ) کا "الکشکول" جو مصر میں کئی مرتبہ طبع ہو چکا ہے، اسی سلسلہ میں کشکول الجشتی، کشکول جمال اور "الکشکول فی التصوف" بھی قابل ذکر ہیں۔

قزاق. قزاق بمعنی ڈاکو، راہزن، لٹیرا،

اور قزاقی بمعنی لوٹ مار، غارتگری۔

اردو زبان میں قزاق کا لفظ مذکورہ بالا جس مفہوم ومعنی میں مستعمل ہے، وہ محض استعارہ ہے اور یہ وہ مفہوم ہے جو اس لفظ کو سب سے پہلے ترکی قبیلوں اور قوموں نے دیا تھا، اور پھر انکے اثر سے وہی مفہوم نہ صرف اردو بلکہ متعدد مغربی زبانوں میں بھی رائج ہو گیا ہے، یہ مفہوم کیسے پیدا ہوا، اس کی مختصر تشریح ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

قزاق ایک معروف تاتاری قبیلہ ہے، جو بلاد روس میں کئی صدیوں سے آباد چلا آرہا ہے، اس قبیلہ کے لوگ اپنی جوانمردی اور عسکری صفات کے لیے مشہور تھے، چنانچہ زار روس نے ان کو فوجی خدمت کے معاوضہ میں وسیع اراضی بطور جاگیر عطا کی تھیں، اور دوسری مراعات بھی دی تھیں، اور ان کے قبیلوں اور فوجی دستوں کو اپنی سلطنت کی سرحدوں پر متعین کیا تھا، قزاق اپنے ہمسایہ ترکی قبیلوں کے ساتھ اکثر برسرپیکار رہتے تھے، اور اس سے بیشتر بھی اپنے قرب وجوار کی اقوام پر غارتگری کرنے کے عادی تھے، اس لیے ترکی قبیلوں کے لوگ ان کو لٹیرے اور ڈاکو سمجھتے تھے، یہاں تک کہ قزاق کا لفظ ان کے ہاں غارتگر اور راہزن کا مترادف

بن گیا اور یہی وہ مفہوم ومعنی ہے، جو ترکوں کے اثر سے ہندوستان میں بھی عام ہو گیا ہے، ترک لوگ اس کا تلفظ تشدید کے ساتھ "قزّاق" کرتے ہیں، اور یہی تلفظ ہندوستان میں رائج ہے، لیکن یہ لفظ در اصل مشدد نہیں ہے۔

روسی زبان میں قزاق کو Kazak یا Kozak لکھتے ہیں اور انگریزی میں Cossack

قزاق از روئے مذہب مسلمان ہیں، اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ تھی، جب زار روس کی حکومت کے بعد بالشویک برسر اقتدار آئے تو قزاق کئی سال تک ان کے ساتھ برسرپیکار رہے، آج سے تقریباً پچیس ۲۵ سال پہلے کی بات ہے، انگریزی عہد میں قزاق قوم کے چند سو خاندان سیاسی اختلاف کی بنا پر بلاد روس سے ہجرت کر کے ہندوستان میں چلے آئے تھے، ان کے چند خاندان کچھ عرصہ تک لاہور میں بھی مقیم رہے، اور مجھے ان کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ شکل وصورت میں یارقندیوں کے ساتھ بہت مشابہت رکھتے تھے، اور غریب الدیار ہونے کے باوجود ان کی رفتار وگفتار میں عالی تعریف وقار پایا جاتا تھا، جب برطانوی حکام کو ان کو ہندوستان میں آباد کرنے کی کوئی تسلی بخش صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے ترکی حکومت کی رضامندی سے ان کو ترکی میں منتقل کر دیا، قزاق قوم کے یہ مہاجر خاندان جب تک لاہور میں مقیم رہے، اہل شہر کو ان سے کسی قسم کی شکایت کا موقع پیدا نہیں ہوا۔ اور ان کی خودداری اور خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اور کسی سے کسی طرح کی امداد طلب نہیں کی، بلکہ یہ لوگ اون اور کھال کی ٹوپیاں بنا کر بازار میں فروخت کرتے تھے، اور اپنی دستکاری اور ذاتی محنت مزدوری سے گزر اوقات کرتے تھے، میں نے یہ بھی دیکھا کہ چند قزاق نوجوانوں نے عربی مدارس میں داخلہ لے رکھا تھا، تلک امۃ قد خلت، لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔

یکی چری۔ یکی چری، جس کا تلفظ ینی چری ہے، ترکی زبان کا ایک مرکب کلمہ ہے، یہ کلمہ جس کا معنی "جدید فوج" ہے، دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، یکی اور چری۔ یکی کی قدیم صورت ینگی تھی، لیکن عثمانی ترک اسے یکی لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ ینی کرتے ہیں اور اس کا معنی جدید ہے، اور چری کا معنی فوج ہے، لہذا "یکی چری" کا معنی ہوا "جدید فوج"۔

عثمانی خاندان کے دوسرے حکمران سلطان اورخان (۱۳۲۶ء تا ۱۳۵۹ء) نے ایک نئی فوج مرتب کی تھی، اور اسے یکی چری کا نام دیا تھا، یہ فوج مدت دراز تک فتح وظفر کے پرچم اڑاتی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس میں بدنظمی اور خودسری پیدا ہوگئی، اور وہ دولت عثمانیہ کے لیے ایک مصیبت بن گئی، آخر کار سلطان محمود خان ثانی نے ۱۸۲۶ء میں اس کا خاتمہ کر دیا،

یکی چری کو فرانسیسی مصنفین نے Janissaire اور انگریزی مؤلفین نے Janissary لکھا ہے، اور انگریزی کتابوں کے اردو مترجموں نے جو غالباً اس لفظ کی اصل حقیقت سے واقف نہ تھے، Janissary کا ترجمہ "جان نثار" یا "جان نثاری فوج" کیا ہے، Janissary سے جان نثاری کی طرف جس طرح ان کا ذہن رسا منتقل ہوا ہے اس کی بہر حال داد دینی چاہیے۔

عربی مصنفین نے یکی چری کو کبھی انکشاری، کبھی ینکشری اور کبھی ینکشریہ لکھا ہے۔

استدراک

بر مقالۂ ڈاکٹر اکملؔ ایوبی صاحب

اب میں ڈاکٹر اکمل صاحب ایوبی کے دلچسپ اور قابل قدر مضمون کی طرف توجہ کرتا ہوں، اس میں چند باتیں محل نظر ہیں، اور چونکہ ان کا تعلق چند اصولی امور سے ہے، اس لیے ان کا یہاں تذکرہ

ضروری سمجھا گیا، ورنہ ان کے عالمانہ مقالہ کی تنقید یا ان کے ساتھ مباحثہ کرنا مقصود نہیں، کیونکہ جہاں تک اردو میں ترکی زبان کے الفاظ اور اس کے اثرات کی اہمیت کا تعلق ہے، مجھے ان کے ساتھ بہت حد تک اتفاق ہے۔

مثلاً بعض الفاظ کو ڈاکٹر صاحب نے ترکی بتایا ہے، لیکن میری ناقص رائے میں وہ ترکی نہیں ہیں، سپاہی کا لفظ ترکی نہیں بلکہ قطعاً فارسی ہے، اس کی قدیم اصلی صورت اسپاہی تھی جو مشتق ہے اسپ (گھوڑا) سے۔ لہذا اسپاہی دراصل وہ فوجی یا لشکری ہے جو اسپ سوار یعنی گھوڑ سوار ہو۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، اسپ ایک خالص فارسی لفظ ہے جس کا سنسکرت میں مترادف اشو ہے۔

اس ضمن میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا شاید خارج از بحث نہ ہوگا کہ ایران کے شاہان قدیم نے اپنی مملکت کے مرکز میں ایک بڑی بھاری چھاؤنی قائم کی تھی، جو اسپاہان یا سپاہان کے نام سے مشہور ہوئی، اسی اسپاہان کو بعد ازاں اسلامی دور میں عربوں نے اصفہان بنا لیا۔

اسی طرح شلوار کا لفظ بھی ترکی نہیں، بلکہ فارسی ہے، اور بعض علما کا قول ہے کہ عربی کا لفظ سربال (جس کی جمع "سرابیل" پارچہ جات یعنی لباس کے معنی میں قرآن مجید سورۃ النحل میں استعمال ہوئی ہے) اسی شلوار سے مشتق ہے۔

سربال کی ایک دوسری صورت سروال ہے، جو آجکل نجد میں مروج ہے، مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر فرینکل کی کتاب جس کا نام حاشیہ میں مندرج ہے[1]۔

ڈاکٹر صاحب نے پاٹچہ کو بھی ترکی الفاظ کی فہرست میں شامل کر دیا ہے، حالانکہ یہ لفظ

---

[1] Die Aramaischen Fremdworter im Arabischen von S. Fraenkel (Leiden 1886) P. 47

فارسی ہے، اور پائے (پاؤں) اور چہ کے لاحقہ سے مل کر بنا ہے۔ پائے قطعاً فارسی ہے، اور اردو کا لفظ پاؤں اسی کی صورت ہے، یہی لفظ دیگر آریائی زبانوں میں بھی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف صورتوں میں موجود ہے، مثلاً سنسکرت میں پاد یا پات ہے، یونانی میں پوس، لاطینی میں پیڈ (ped) جس سے pedal کا لفظ ماخوذ ہے) اور پنجابی میں پیر کی صورت میں پایا جاتا ہے، باقی رہا چہ، سو یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ چہ فارسی میں الفاظ کو مصغر بنانے کے لیے آتا ہے۔ اس لاحقہ تصغیری کی مثالیں دیگر آریائی زبانوں میں بھی موجود ہیں، اس موقع پر میں صرف جرمن زبان کی نظیروں پر اکتفا کرتا ہوں جس میں اسم مصغر بنانے کے لیے چہ کی بجائے Chen کا حرف استعمال ہوتا ہے، مثلاً لفظ Madchen میں chen تصغیر کی علامت ہے، اسی طرح آپ Greta سے Gret chen اور Dora سے Dorchen بنا سکتے ہیں۔ اس تفصیل سے مقصد یہ ہے کہ پاچہ کا لفظ جن اجزاء سے مرکب ہے، وہ دونوں خالصتہً فارسی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے نقارہ کو بھی ترکی بتایا ہے، حالانکہ نقارہ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے کہ میرا مولد میرا منشاء عرب کا خشک خطہ ہے، نقارہ عربی مادہ نقر سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز پر ضرب یا چوٹ لگانا یا کسی پرندے کا چونچ سے ٹھونگیں مارنا، اسی لیے ہدہد یعنی کھٹ بڑھئی کو نقار الخشب کہتے ہیں، اور پرندے کی چونچ کو منقار۔ اسی مادہ سے عربی کے چند اور الفاظ بھی بنے ہیں جو نقارہ کے ہم جنس ہیں، مثلاً ناقور یعنی بگل بجانے والا، نقارہ اپنے وزن فعّالہ کے لحاظ سے بھی ایک ٹھیٹھ عربی لفظ ہے۔

تندور کو ڈاکٹر صاحب نے ترکی بتایا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ ترکستان میں یہ لفظ اسی صورت میں مروج ہے، لیکن میرے خیال میں یہ عربی اور آرامی لفظ تنّور کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

تنّور کا لفظ قرآن مجید میں طوفانِ نوح کے ضمن میں دو مرتبہ مذکور ہوا ہے، پنجاب میں اور غالباً اور مقامات میں بھی عوام تندور ہی بولتے ہیں، اور یہ تلفظ غالباً ترکی اثر کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کمرہ کو بھی ترکی الفاظ کی فہرست میں داخل کر دیا ہے، حالانکہ یہ لفظ جہاں تک مجھے معلوم ہے، پرتگالی ہے، پرتگالی زبان میں اسے Camara لکھتے ہیں جو لاطینی کلمہ Camera ہی کی ایک صورت ہے، ترکی زبان میں کمرہ کے لیے اوطہ یا اُودہ کا لفظ ہے جس کو شام کے عربوں نے اوضہ بنا لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ترکی الفاظ کے سلسلہ میں کلابتو کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس لفظ کی مکمل شکل کلابتون ہے، جو آلتون (سونا) سے مل کر بنا ہے، اس کے نون کو حذف کرنے کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی،

اس موقع پر اگر لفظ کلابتون کی مختصر لغوی تشریح کر دی جائے، تو شاید بے محل نہ ہوگی، یہ دو لفظوں سے مرکب ہے، کلابہ یا کلاوہ بمعنی سوت کا لچھا یا محض لچھا اور آلتون بمعنی سونا، لہذا کلابتون کے لفظی معنے ہوئے "سنہرا لچھا"۔

ڈاکٹر صاحب لفظ باورچی کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "باورچی باور اور چی سے مرکب ہے باور کے معنے یقین کرنا، اعتبار کرنا ہیں اور چی کلمۂ نسبت ہے۔" ڈاکٹر صاحب کو یہ بات تسلیم ہے کہ باورچی ترکی لفظ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی تشریح ایک فارسی لفظ باور کے ذریعے کرتے ہیں، جو غیر منطقی اور ناقابل قبول بات ہے، لیکن در اصل یہ ڈاکٹر صاحب کا قصور نہیں، ان کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے اس معاملہ میں بغیر پوری تحقیق کے پلاٹس پر اعتماد کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کے اشتقاق و ماخذ کی تحقیق میں پلاٹس صاحب ہرگز ایسے قابل اعتماد سند نہیں ہیں کہ ان کے ہر قول کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے، میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ انھوں نے

بہت سے کلمات کی لغوی تشریح میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، جن کی نشاندہی میں اپنی بعض تحریروں میں کر چکا ہوں اور جس کے تکرار کا یہ موقع نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "اردو زبان میں بغیر علامت اضافت دو اسموں کو ملا کر مرکب لفظ بنانے کی متعدد مثالیں موجود ہیں، جیسے بوٹ پالش، جیب گھڑی، سبزی منڈی، ڈاک خانہ، گھنٹہ گھر وغیرہ۔ چونکہ یہ قاعدہ فارسی اور عربی کے بجائے ترکی زبان میں موجود ہے، اس لیے میرے خیال سے یہ ترکی زبان کا اثر ہے، جو اردو نے قبول کیا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے، وہ بوجوہ ذیل صحیح نہیں ہے۔

مرکب الفاظ بنانے کے جس دستور کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا جملہ میں کیا ہے، اس کے متعلق علمائے لغت مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرکب الفاظ بنانے کے بارے میں سامی اور آریائی زبانوں کا طریق کار الگ الگ ہے، سامی زبانوں میں جنمیں عربی بھی شامل ہے، مرکب اضافی اور توصیفی کو چھوڑ کر دو لفظوں کو ملا کر نئے مرکب الفاظ بنانے کا دستور نہیں ہے، اگر زمانہ کے نئے تقاضوں سے نئے الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ ضرورت اشتقاق کے عمل سے پوری کی جاتی ہے، یعنی کسی مادہ یا اصل (Root) سے اشتقاق کے ذریعہ سے نئے الفاظ وضع کر لیے جاتے ہیں، مثلاً جب "اوری انٹلسٹ" (Orientalist) کے لیے ایک مناسب عربی لفظ کی تلاش ہوئی تو مادہ "شرق" سے "مستشرق" کا نیا لفظ بنا لیا گیا ہے، جو عربی میں پہلے موجود نہ تھا، اور یہ نیا لفظ اشتقاق کے ذریعہ سے حاصل ہوا۔

لیکن سامی زبانوں کے برعکس آریائی یعنی انڈو یورپی زبانوں میں، جن میں فارسی، اردو، ہندی، فرانسیسی، جرمن اور یونانی وغیرہ زبانیں شامل ہیں، اشتقاق سے کام نہیں چلتا، کیونکہ اس کا دائرہ عمل ان زبانوں میں بہت محدود ہے، لہذا ان زبانوں میں دو لفظوں کو باہم ترکیب دیکر نئے مرکبات وضع کرنے کا دستور

عام ہے، مثلاً فارسی دانوں کو جب "اوری انٹلسٹ" کے لیے موزوں لفظ کی جستجو ہوئی تو انھوں نے دو لفظ "خاور" اور "شناس" لیکر ان سے حسب دلخواہ ایک نیا لفظ "خاور شناس" بنا لیا، اس لفظ کے علاوہ فارسی میں آتشکدہ، بتکدہ، میخانہ، لالہ رخسار، لالہ زار، گلبدن، پری پیکر اور (شیخ سعدی کا) ماہرخ اور پری رو اور (خواجہ حافظ کا ساقی) سیم ساق وغیرہ مرکب الفاظ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

فارسی کے علاوہ دیگر آریائی زبانوں کے مرکب الفاظ کی مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

اردو میں میوہ منڈی، عجائب گھر، چڑیا گھر، خریدار، چھاپہ خانہ، اٹھائی گیرا، گرہ کٹ، جیب کترا، چغلخور وغیرہ،

ہندی میں اُڑن کھٹولا، پن گھٹ، بن باس، بن مانس، مُرگباسی، سورج مکھی، دھرم سالہ، دھرم پتنی، گاؤ رکشا، مورتی پوجا، وغیرہ

انگریزی میں Timepiece- sunflower- afternoon- Headache
Merry- making اور Weathercock وغیرہ

فرانسیسی میں Lance-Pierre (منجنیق) Mille-pieds (ہزار پا) Tete-a-tete (سرگوشی) Papier-monnaie

جرمن زبان میں kindergarten، tiergarten (چڑیا گھر) Baumwolle- (کپاس)؛ Blitzkrieg وغیرہ

یونانی میں Philosophia (فلسفہ) Philologia (علم اللغہ)
melagkholia (مالیخولیا) اور Hydropholia وغیرہ

اوری انٹلسٹ کی مذکورہ بالا مثال سے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب عربوں کو اس لفظ کے ترجمہ کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے صرف ایک مفرد لفظ سے اپنی ضرورت کو پورا کر لیا، اسکے برخلاف فارسی دانوں کو "خاور شناس" وضع کرنے میں دو لفظوں سے کام لینا پڑا، عربی زبان اور اسکے اسلوب بیان کے

ایجاز و اختصار کا راز اسی نکتہ میں مضمر ہے، خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، میں درحقیقت یہ امر واضح کرنا چاہتا ہوں اور ناظرین کرام کو اس نکتہ پر لانا چاہتا ہوں کہ اگر اردو میں مرکب الفاظ بنانے کا دستور موجود ہے تو یہ آریائی زبانوں کا ایک مسلمہ قاعدہ اور خاصہ ہے، اس میں کسی ترکی اثر کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے غوری خاندان کو بھی ترکی حکومتوں میں شامل کر لیا ہے، مگر یہ بات درست نہیں، غوری ترک نہ تھے، افغان تھے، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ترک اور افغان ایک ملک (افغانستان) میں جمع نہیں ہو سکتے، اسی بنا پر غزنوی اور غوری خاندانوں میں باہم تصادم ہوا اور اس تصادم نے ایسی ہولناک صورت اختیار کی کہ علاء الدین غوری کو جب غلبہ حاصل ہوا تو اس نے جوش انتقام میں غزنہ کے شہر کو (جسے غزنوی حکمرانوں کی علم دوستی اور انکے جاہ و جلال نے اپنے زمانہ کا عروس البلاد بنا دیا تھا) جلا کر خاک سیاہ کر دیا اور تاریخ میں "جہاں سوز" کا لقب پایا،

ڈاکٹر ایوبی صاحب لکھتے ہیں کہ "ترکی اور اردو زبانوں کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب عموماً ایک جیسی ہوتی ہے اور ایک زبان کا ترجمہ اگر دوسری زبان میں لفظ بلفظ کر دیا جائے تو وہ خود بخود بامحاورہ ترجمہ ہو جاتا ہے"، لیکن یہ بات تو فارسی جملہ پر بھی صادق آتی ہے، مثلاً ہم فارسی میں کہتے ہیں کہ "حسن نان خورد"۔ اس جملہ میں پہلے فاعل آیا ہے، پھر مفعول اور سب سے آخر میں فعل ہے، اجزاء جملہ کی یہی ترتیب اس جملہ کے اردو ترجمہ میں بھی پائی جاتی ہے: "حسن نے روٹی کھائی"، اس صورت میں ترکی اثرات کو ترجیح دینے کی مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

مجھے اس نظریہ سے بھی علی وجہ البصیرت شدید اختلاف ہے کہ اردو پر (جس میں زبان اور ادب دونوں کو شامل کرنا چاہیے) عربی اور فارسی کے مقابلہ میں ترکی اثرات زیادہ ہیں، چونکہ ڈاکٹر صاحب نے اسکی تائید میں کوئی ٹھوس براہین قاطع اور دلیل ساطع پیش نہیں فرمائی، اسلیے میں بھی فی الحال اس بحث کو اس موقع پر چھیڑنا نہیں چاہتا، کیونکہ یہ بحث ایک الگ مستقل مقالہ کا مقتضی ہے اور یہ واقعہ ابتدائی نوٹ پہلے ہی سے میری منشاء کے برخلاف خاصا طویل ہو گیا ہے۔

بہر حال ہم سب لوگوں کو ڈاکٹر صاحب ممدوح کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایک اہم اور دلچسپ لسانی اور علمی موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے اور میں ذاتی طور پر بھی انکا تہ دل سے رہین منت ہوں کہ ان کا مضمون دیکھ کر مجھے اپنے ایک فراموش شدہ لکچر کو اشاعت کے لیے قلمبند کرنے کی تحریک ہوئی، جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

پاکستان میں دو مہینے

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(٢)

کراچی کے قیام میں صرف دارالمصنفین کے خیر خواہوں، علمی حلقے کے لوگوں، اعظم گڈھ والوں اور اپنے عزیزوں سے ملتا رہا، جناب ظہور الحسن صاحب سے ملنے میں عجلت کی، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہ چکے ہیں، ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس ہیں، لکھنؤ میں یو۔ پی حکومت کے محکمہ مالیات کے سکریٹری تھے، پنشن پانے کے بعد اپنے صاحبزادے ابن الحسن صاحب کے پاس چلے گئے ہیں، جو اس وقت کراچی میں نیشنل بینک میں چیف پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں، ان سے مفید مشورے کی امید تھی، اس لیے ان کے گھر پر ملا، جو پاکستان امپلائیز کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی میں ہے، وہ اسی اخلاق سے ملے جس کی ان سے توقع تھی، لکھنؤ میں اپنے مذہبی شغف کے لیے مشہور تھے، کراچی میں بھی سارا وقت عبادت و ریاضت میں گذارتے ہیں، ان کے صاحبزادے پر بھی مذہبی اثرات ہیں، ان کو بھی صوم و صلوٰۃ کا پابند اور تلاوت کلام پاک کرتے دیکھا، دونوں سے دارالمصنفین کے مسائل پر گفتگو ہوئی اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہاں دارالمصنفین کے جو خیر خواہ ہیں، ان کو یکجا کر کے مفید باتیں کی جائیں۔

جناب سید حسام الدین راشدی صاحب سے ملنے کے لیے مشتاق تھا، کیونکہ انھوں نے پہلے ہی سے دارالمصنفین کے لیے خوشگوار فضا پیدا کر رکھی تھی، ان سے وقت طے ہوا تو آٹھ بجے رات کو ان سے جمشید روڈ پر ان کے دولت کدہ بیت الضیاء میں ملا، وہ اپنے کتب خانہ میں بیٹھے تھے، جہاں پہنچکر محسوس ہوا کہ وہ صرف

کتابوں کی فضا چاہتے ہیں، کتب خانہ ان کے لیے ہے اور وہ کتب خانہ کے لیے ہیں، انگریزی لباس میں تھے، مگر ملنے ملانے، اٹھنے بیٹھنے، ساتھ چلتے وقت آگے پیچھے رہنے اور باتیں کرنے میں دہلی اور لکھنؤ کی پرانی تہذیب کی یاد تازہ کرتے ہیں، سندھ کے غالباً بڑے رئیسوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن اپنی ملاقاتوں اور خصوصاً علمی لوگوں سے ملنے ملانے میں بڑی خاکساری اور وضعداری کو راہ دیتے ہیں، ان سے ۱۹۵۵ء میں کراچی ہی میں ملا تھا، تقریباً پندرہ برس کے بعد پھر ملاقات ہوئی، تو ہم دونوں دیر تک گلے سے لگے رہے، انکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح میری خاطر کریں، مسلسل سفر کی وجہ سے مجھکو نزلہ اور زکام ہو گیا تھا، کھانسی برابر آ رہی تھی، گھر سے دوا منگوائی اور استعمال کرنے کو کہا، باتیں شروع ہوئیں تو سلسلہ ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، رات کے دس بج گئے پھر بھی جی چاہا کہ بیٹھا باتیں کرتا رہوں۔

میں انکے علمی کارناموں کا بڑا قدردان ہوں، وہ جب کوئی علمی کام کرتے ہیں تو محنت و کاوش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، ۱۹۵۷ء میں ان کا ایڈٹ کیا ہوا تذکرہ مقالات الشعراء مؤلفہ میر علی شیر قانع تتوی (المتوفی ۱۲۰۳ھ) نظر سے گذرا تھا، اس میں ۷۱۹ فارسی شعراء کا ذکر ہے، اس کے مؤلف کو تاریخ سندھ پر ایک بہت ہی کارآمد کتاب تحفۃ الکرام کے مصنف کی حیثیت سے تو جانتا تھا، لیکن جناب راشدی صاحب نے مقالات الشعراء کے شروع میں اس کے جو حالات لکھے ہیں، ان کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ وہ نہ صرف ایک پُرگو شاعر تھا بلکہ اس نے ۴۳ کتابیں لکھیں، راشدی صاحب نے ان کتابوں کے نام بڑی محنت سے ڈھونڈ نکالے ہیں، ان ہی کی وجہ سے اس قابل قدر مصنف کی علمی اور ادبی سرگرمیاں منظر عام پر آئیں ورنہ بالکل بھلا دی گئی ہوتیں، راشدی صاحب نے اس کتاب کا مقدمہ سلیس اور رواں فارسی ہی میں لکھا ہے، جو اس زبان پر ان کی قدرت کی دلیل ہے، انکے جس علمی و ادبی شاہکار سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، وہ انکی ایڈٹ کی ہوئی تذکرۂ شعرائے کشمیر ہے، جو چار جلدوں میں ہے، انکو پہلے آپ اصلح متخلص بہ میرزا ابن حاجی محمد اسلم خاں سالم کشمیری کا ایک تذکرہ ملا جس میں ۳۰۰ فارسی شعراء کا ذکر ہے، اور ان کے اشعار کے نمونے ہیں، تذکرہ نگار محمد شاہ کے عہد کا ہے، اس میں اس نے زیادہ تر عالمگیری عہد سے لیکر محمد شاہی دور تک کے شعراء کا ذکر کیا ہے جن کی اکثر و بیشتر تعداد کشمیر سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی خود مؤلف نے اسی

تذکرہ کا کوئی نام نہیں رکھا تھا، لیکن راشدی صاحب نے ایڈٹ کرتے وقت اس کا نام تذکرۂ شعرائے کشمیر رکھ دیا جس کے بعد انھوں نے یہ ذمہ داری محسوس کی کہ کشمیر میں فارسی کے اور جتنے شعراء گذرے ہیں ان کے حالات و آثار بھی جمع کیے جائیں، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی غیر معمولی محنت اور کاوش سے اتنا مواد جمع کر لیا کہ ان کو مزید تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں جن جن شعراء کا ذکر آیا ہے، ان سے متعلق جتنے تذکروں میں ان کو جو کچھ ملا، ان کے تمام اقتباسات جمع کر دیے ہیں، جس کے بعد قارئین یا محققین کو ان شاعروں سے متعلق کوئی اور کتاب دیکھنے کی زحمت نہ اٹھانی ہوگی، ان شعراء نے اپنی نظموں میں جن باغات، تاریخی مقامات اور واقعات کے حوالے دیے ہیں ان پر بھی حواشی اور ضروری معلومات فراہم کیے ہیں، اتنی جانکاہ کاوش اور صبر آزما محنت سے کم کسی کتاب کی ترتیب اور تدوین ہوئی ہوگی، یہ چاروں جلدیں ان مصنفوں اور مولفوں کے لیے سبق آموز ہیں جو عجلت میں اپنی کتابیں شائع کر کے سستی شہرت حاصل کرتے ہیں، نہ صرف راشدی صاحب بلکہ اس برصغیر کا علمی حلقہ اس کارنامہ پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

راشدی صاحب کی مزید علمی سرگرمیوں کی تفصیل ان سے مختلف ملاقاتوں میں ہوئی، اور وہ اب تک فارسی کی حسب ذیل کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کر چکے ہیں: (۱) مثنوی چانیسر نامہ از ادراکی بیگلار (۱۹۵۶ء) (۲) مقالات الشعراء از قانع ٹھٹھوی (۱۹۵۷ء) (۳) مثنوی مظہر الاعصار (۱۹۵۷ء) (۴) تکملہ مقالات الشعراء از خلیل ٹھٹھوی (۱۹۵۸ء) (۵) قصائد و مثنویات از قانع ٹھٹھوی (۱۹۶۱ء) (۶) مثنویات ہشت بہشت از عطا ٹھٹھوی (۱۹۶۳ء) (۷) تاریخ مظہر شاہجہانی از یوسف میرک (۱۹۶۴ء) (۸) منشور الوصیت از میاں نور محمد (۱۹۶۴ء) (۹) تاریخ ترخان نامہ از میر محمد ٹھٹھوی (۱۹۶۷ء) (۱۰) تذکرۂ حدیقۃ الاولیاء از عبد القادر ٹھٹھوی (۱۹۶۷ء) (۱۱) تذکرہ شعرائے کشمیر از میرزا محمد اصلح (۱۹۶۷ء) (۱۲) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش اول (۱۹۶۷ء) (۱۳) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش دوم (۱۹۶۷ء) (۱۴) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش سوم (۱۹۶۷ء) (۱۵) تذکرہ روضۃ السلاطین از فخری ہروی (۱۹۶۸ء) (۱۶) تذکرہ جواہر العجائب از فخری ہروی (۱۹۶۸ء)

(۷) دیوان فخری ہروی ۱۹۶۸ء (۸) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش چہارم ۱۹۶۹ء)

مذکورۂ بالا کتابوں کو ایڈٹ کرنے میں راشدی صاحب نے جو مشقت کی ہے وہ علمی و ادبی تاریخ میں ایک بہت بڑی خدمت شمار کیے جانے کے لائق ہے، وہ اپنی غیر معمولی محنت و ریاضت سے ایڈٹ کی ہوئی کتاب میں بڑا وزن پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً اوپر کی فہرست میں فخری ہروی کے دو تذکرے روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب بہت مختصر ہیں، پہلا ۱۰۸ صفحے اور دوسرا کل ۴۸ صفحے پر مشتمل ہے، پہلے میں ان بادشاہوں، شہزادوں اور امیروں کا ذکر ہے جنھوں نے فارسی یا ترکی زبان میں اشعار کہے، دوسرے میں کچھ شاعرہ خواتین کا ذکر ہے، راشدی صاحب نے ان دونوں تذکروں پر ۱۱ صفحے کا مقدمہ اور ۱۲۰ صفحے کے تعلیقات لکھ کر ان کو علمی دنیا میں ایک اہم جگہ دے دی ہے، جس تحقیق و کاوش سے فخری کے حالات اور اس کی تصانیف کے نام جمع کیے گئے ہیں، ان سے فخری کے بجائے خود راشدی صاحب قارئین کے دل و دماغ پر چھائے نظر آتے ہیں، روضۃ السلاطین ۹۵۳ھ کے بعد لکھی گئی اور جواہر العجائب ۹۶۳ھ میں قلمبند ہوئی، یہ دونوں تذکرے سندھ کے قدیم دار السلطنت ٹھٹھہ میں تصنیف ہوئے، راشدی صاحب نے اپنے مقدمہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ فارسی زبان میں سب سے پہلا تذکرہ تذکرۂ شعراء ہے جو ملتان میں ۶۰۰ھ سے پہلے لکھا گیا تھا، اس کے بعد عوفی کی لباب الالباب ہے جو سندھ ہی میں ۶۲۵ھ میں مرتب ہوئی، اس لحاظ سے راشدی صاحب کو بجا طور پر فخر ہے کہ فارسی زبان میں تذکرہ نویسی کی بنیاد سندھ میں پڑی، پھر شیر علی نوائی کی مجالس النفائس (۸۹۲ھ)، فخری ہروی کی روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب سندھ ہی میں لکھی گئیں، جس سے ظاہر ہے کہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں سندھ کی یہ خدمت کوئی معمولی خدمت نہیں، اس خدمت کے ذکر کرنے میں راشدی صاحب کا قلم بڑا شاداں اور فرحاں ہو گیا ہے، انھوں نے روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب کا مقدمہ تو باوقار اردو میں لکھا ہے لیکن تعلیقات فارسی میں قلمبند کیے ہیں جن کو پڑھنے سے دونوں زبانوں پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی مادری زبان سندھی ہے، اس لیے سندھی زبان کے علوم کی خدمت میں بھی لگے ہوئے ہیں، اس زبان میں ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) مولانا محب علی سندھی ۱۹۴۲ء (۲) سندھی ادب (۱۹۵۰ء) (۳) مہران جون موجون ۱۹۵۶ء (۴) تذکرہ امیر خانی (۱۹۶۱ء) (۵) اک ہیپیا دل ۱۹۶۵ء (۶) اگلی نامہ قانی ۱۹۶۷ء۔ موخر الذکر کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اردو میں ان کی دو کتابیں ہفت مقالہ اور دود چراغ محفل شائع ہوئی ہیں۔ اور یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان کے پاس فارسی، سندھی، اردو کتابوں کے ۲۹ مسودے تیار ہیں جو جلد شائع ہونے والی ہیں، ان میں تاریخ رشیدی از میرزا حیدر دوغلت، تاریخ فرامین سلاسل تیموریان اور سلسلۂ نورجہاں بیگم زن جہانگیر بادشاہ، سندھی اردو، تذکرۂ میر معصوم بھکری، غازی ترخان اور اس کی بزم ادب بھی شامل ہیں، فارسی ادب کی خدمت کے صلہ میں ان کو حکومت ایران کی طرف سے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۶ء میں دو مرتبہ نشان سپاس کے تمغے مل چکے ہیں، پاکستان کی حکومت نے ان کی علمی خدمات کو ستارۂ امتیاز دے کر سراہا ہے، اور پھر معلوم نہیں کتنے رسائل و جرائد کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں، ۱۹۳۰ء میں سکھر سے المنار ایک ماہانہ رسالہ نکلا تو اس کے اڈیٹر ہوئے، پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک سندھ زمیندار کے اڈیٹر رہے، ستارۂ سندھ (۱۹۳۴-۳۷ء) الوحید (کراچی) (۱۹۴۰-۴۲ء) قربانی (۱۹۴۵-۴۷ء) ان ہی کی ادارت میں شائع ہوئے، سہ ماہی رسالوں میں مہران کراچی، اردو کراچی، پارس کراچی کے بھی اڈیٹر رہے، طہران سے ایک رسالہ ۱۹۶۷ء سے ایران شناسی نکلا کرتا ہے، اس کے بھی اڈیٹر ہیں، مغربی پاکستان کی شاید ہی کوئی علمی یا ادبی مجلس ہو جس کے وہ اہم رکن نہیں، اور پھر وہاں کی یونیورسٹیوں کی کسی نہ کسی کمیٹی کے ممبر ضرور منتخب کیے جاتے ہیں، ایشیا اور یورپ کے ممالک کی بھی سیاحت کرتے رہتے ہیں، ۱۹۶۳ء میں پاکستان کی طرف سے بغداد کی ہزار سالہ سالگرہ کے موقع پر عراق بھیجے گئے، ۱۹۶۴ء میں افریقہ اور ایشیا کے زبان دانوں کی کانفرنس ماسکو میں ہوئی، تو ان ہی نے

اس میں پاکستان کے وفد کی قیادت کی، ۱۹۶۴ء میں طہران میں ایرانیات کے ماہروں کی بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کی، ۱۹۶۵ء میں چین گئے، جہاں مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔

انھوں نے کسی یونیورسٹی میں باضابطہ تعلیم نہیں پائی لیکن سندھی، اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور عربی میں ان کی غیر معمولی قابلیت خداداد ہے، جس میں وہ اپنی محنت اور ریاضت سے جلا دیتے رہتے ہیں، ان کا اصلی وطن بھمن ضلع لڑکانہ سندھ میں ہے، ۱۹۱۱ء میں یہیں پیدا ہوئے، کراچی میں مستقل طور پر رہتے ہیں، اور شب و روز علوم و فنون کی خدمت کے لیے لگے رہتے اور سرگرداں دکھائی دیتے ہیں، وہ باتیں کرتے ہیں تو انکی بے تکلفی میں متانت اور انکی متانت میں بے تکلفی ہوتی ہے، دار المصنفین کے علمی کارناموں کے بہت مداح ہیں، کہنے لگے کہ خدا کی قسم میں نے جو کچھ سیکھا ہے دار المصنفین کی کتابوں ہی سے سیکھا ہے، انکی اس قسم سے بیحد متاثر ہوا، اور مجھکو بھی اپنے ادارہ پر فخر محسوس ہوا، اس کے مسائل اور مشکلات پر گفتگو آئی تو کہا اپنے یہاں کسی وزارت کے کھانے پر کراچی کے تمام اہل علم کو جمع کرکے ان کے سامنے اس کی مشکلات کو پیش کروں گا۔

ان کے دولت کدہ پر ۲۰ نومبر کو یہ اجتماع ہوا، جس میں کراچی کے حسب ذیل ممتاز اہل قلم سے ایک جگہ ملنے کا اتفاق ہوا،

(۱) ممتاز حسن صاحب۔ وہ یہاں کی علمی مجلسوں کے روح رواں ہیں، انگریزی، فارسی، عربی اور اردو کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں، اقبال اور غالب کے پرستاروں میں ہیں، حکومت پاکستان کے محکمۂ خزانہ کے سکریٹری تھے، اس عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد نیشنل بینک کے ڈائرکٹر ہوئے، آجکل نیشنل بک ٹرسٹ کے ڈائرکٹر ہیں، ان کی علمی گفتگوؤں میں وزن کے ساتھ بڑی شگفتگی ہوتی ہے، ان سے پندرہ برس پہلے کراچی میں ملا تھا جب کہ انھوں نے پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کی درآمد کے

سلسلہ میں سرکاری مدد پہنچائی تھی، اور اس کے لیے پچاس ہزار کا لائسنس بھی منظور کرایا تھا، اسی جذبۂ ممنونیت کے ساتھ ان سے ملنے میں خوشی ہوئی، کراچی کے تمام لوگ ان کی شرافت، اخلاق، جذبۂ اخلاص اور پاکیزہ ذوق علم و ادب کے معترف ہیں، ان کو علمی اداروں کا سرپرست یا کسی کانفرنس کا صدر بنانے میں مسرت اور عزت محسوس کرتے ہیں، وہ علی گڈھ کے اولڈ بوائے بھی ہیں، ان کا ذکر خیر آگے بھی آئے گا۔

(۲) ڈاکٹر معین الحق۔ پہلے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تاریخ کے استاد تھے، اب پاکستان کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، اور اس کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، بہت سی کتابیں ایڈٹ کی یا لکھی ہیں، ان کی ایڈٹ کی ہوئی کتابیں یہ ہیں: (۱) تذکرۃ الخوانین جلد اول ذکاری (۲) ایم، ڈی، سلین نے انگریزی میں ابن خلکان کی وفیات الاعیان کا ترجمہ چھ جلدوں میں کیا تھا، ان کو بھی ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے (۳) آثار الصنادید از سر سید احمد، اس کتاب کو مفید حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے، سر سید کی زندگی میں اس کا جو اڈیشن شائع ہوا تھا، اس کے بعد اس کا حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا، ڈاکٹر صاحب کی محنت سے اب یہ آسانی سے دستیاب ہونے لگی ہے (۴) سرکشی ضلع بجنور از سر سید احمد خاں، اس میں سر سید کے حالات ۱۲۸ صفحے میں لکھے گئے ہیں، جو خود ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ (۵) اخبار رنگین، اس سے شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی دہلی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے لکھنے میں بڑی قدرت حاصل ہے، پاکستان میں انگریزی میں ہسٹری آف فریڈم موومنٹ کے نام سے اب تک کئی جلدیں لکھی جا چکی ہیں، وہ اس کی ادارتی مجلس کے بھی سکریٹری ہیں، ان کی انگریزی تصانیف کے نام یہ ہیں: (۱) برنی کی تاریخ تغلق (۲) اورنگ زیب کا مطالعہ ایک مورخ کی حیثیت سے (۳) ۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم۔ اردو میں انھوں نے حسب ذیل کتابیں لکھی ہیں:-

(۱) اسلامی ہند و پاکستان کی معاشرتی و علمی تاریخ (۲) اسلامی عہد میں فن تعمیر (۳) تاریخ ہند و پاکستان

(۲) ہمایوں کے حالات اس کے آفتابچی جوہر نے تذکرۃ الواقعات کے نام سے مرتب کیے تھے، ڈاکٹر صاحب نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، وہ جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (انگریزی) اور البصائر (اردو) کے اڈیٹر بھی ہیں، جرنل کے بلند پایہ مضامین سے مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق بہت ہی مفید لٹریچر کا اضافہ ہو رہا ہے، وہ اس وقت پاکستان کے بڑے مایۂ ناز مورخ سمجھے جاتے ہیں، اس اجتماع میں ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، میرا موضوع بھی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تاریخ ہے، اس اشتراک ذوق کی بنا پر ہم دونوں کی ملاقات میں بڑی گرمجوشی تھی، ان کے چہرہ پر شگفتگی کے ساتھ علم و تحقیق کی خدمت کے آثار بھی نظر آئے۔

(۳) جمیل الدین عالی صاحب۔ نیشنل بینک میں انکم ٹیکس کے ایڈوائزر ہیں لیکن کراچی کے تمام علمی کاموں کو فروغ دینے میں سرگرم رہتے ہیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد ہیں، اور اس کو اپنی پرانی شاندار روایات کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، رائٹرز گلڈ پاکستان کی بڑی اہم علمی و ادبی تنظیم ہے، اس کے بھی وہ سکریٹری ہیں، خاندان لوہارو سے تعلق رکھتے ہیں، شاعر بھی ہیں، غزلوں کے علاوہ دوہے اور گیت بھی لکھتے ہیں، اور معلوم ہوا کہ خوب جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں، گو مجھکو سننے کا اتفاق نہیں ہوا، انکی ایک تصنیف "نئی کرن" بہت مقبول ہوئی تھی میں نے اس کو نہیں پڑھا، غیر ممالک کی سیاحت بھی کی ہے، اور روزنامہ جنگ میں "دنیا مرے آگے" کے عنوان سے اپنا سفرنامہ بھی لکھتے رہے ہیں، ان کے چہرہ پر شادابی، زندہ دلی، اور غیر معمولی ذہانت پائی۔

(۴) سید الطاف علی بریلوی صاحب۔ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی اور روح رواں ہیں، وہ ہندوستان میں ۱۹۳۴ء ہی سے اپنی مشہور تصنیف حیات حافظ رحمت خاں کی وجہ سے مشہور ہو چکے تھے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، جہاں انھوں نے علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، علی گڑھ کی کانفرنس تو اب بوڑھی ہو چکی ہے لیکن پاکستان

ایجوکیشنل کانفرنس ان کی بدولت جوان ہے، یہ اپنی تعلیمی دلچسپیوں کے ساتھ مفید کتابوں کی اشاعت میں بھی سرگرم ہے، اور اس کی طرف سے پانچ درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس کی کچھ ادبی اور علمی مطبوعات کے نام یہ ہیں:- گلشن بے خار مصنفہ مصطفے خاں شیفتہ و ترجمہ سید احسان الحق فاروقی، مشرقی و مغربی تہذیب از ڈاکٹر احسان محمد خاں، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات از مولانا اعجاز الحق قدوسی، سرسید کا علمی کارنامہ از قاضی احمد میاں جوناگڈھی، اردو زبان اور اسالیب از محمود رضوی، اکبر آبادی وغیرہ، اس کا قابل قدر کارنامہ فن تعلیمات پر اسکی مطبوعات ہیں، امریکہ اور انگلستان کے ماہرین تعلیم مثلاً جان ڈوی، ڈاکٹر زورتھ اسپنسر ارنٹ، سر پرسی نن، اے این وائٹ، میتھو آرنلڈ، ایس سارجنٹ اور میکس ایلٹ مین کی مشہور تصانیف کے جو اردو ترجمے اسکی طرف سے شائع ہوئے ہیں، ان سے اردو زبان میں بڑا اچھا اضافہ ہو گیا، اور یہ جناب سید الطاف علی بریلوی ہی کی مساعی جمیلہ کے نتیجے ہیں، وہ کانفرنس کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ العلم بھی نکالتے ہیں، اس کے مضامین میں بڑا تنوع ہوتا ہے، علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں، اس لیے اس میں اپنی مادر درسگاہ کے متعلق دلچسپ مضامین بھی شائع کرتے رہتے ہیں، رسالہ کے اور دوسرے مضامین میں جان اور حرکت ہوتی ہے جو خود اس کے اڈیٹر کی شخصیت میں بھی پائی جاتی ہے، میں ان سے ملا تو ان کو پیر رعنا کے بجائے جوان رعنا ہی پایا۔

(۵) حکیم سعید احمد صاحب مالک ہمدرد دواخانہ۔ ان سے پہلے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی لیکن اس مرتبہ وہ بہت ہی توانا، شکیل اور جمیل نظر آئے، ہندوستان کے ہمدرد دواخانہ کے مالک ان کے بڑے بھائی الحکیم عبد الحمید صاحب ہیں، جو دار المصنفین سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں، اس تعلق کی بنا پر ان سے ملنے میں اور بھی مسرت ہوئی، ان کی عمر غالباً چالیس سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے پاکستان میں یونانی دواؤں کو جو ترقی دی ہے وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، ہمدرد صحت کے نام سے ایک طبی رسالہ بھی نکالتے ہیں،

جس میں علمی رنگ بھی ہوتا ہے، ان ہی دونوں انھوں نے ابن الہیثم ماہر چشم کا جشن پاکستان کے دونوں حصوں میں بڑے جوش و خروش سے منایا تھا،

(۶) شان الحق حقی صاحب۔ پاکستان کے انفارمیشن سروس میں ہیں، اور اسی کے ساتھ پاکستان کے ادارۂ ترقی اردو بورڈ کے معتمد اعزازی بھی ہیں، اس ادارہ کے ترجمان اردو نامہ کے تین اڈیٹروں میں ایک وہ بھی ہیں، اور دوسرے دو اڈیٹر جوش ملیح آبادی اور خواجہ حمید الدین شاہد ہیں، وہ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، ناول نویس بھی اور تنقید نگار بھی، انکی نظم و نثر کی تصانیف کے کچھ نام یہ ہیں: خیابان پاک، تار پیراہن، نشید حریت، صور اسرافیل، انتخاب ظفر وغیرہ، انکی نگرانی میں ترقی اردو بورڈ کی طرف سے اردو لغت کا کام خاطر خواہ طریقہ پر جاری ہے، اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قدیم دکھنی دور سے لیکر دور حاضر تک ہر لفظ کی تاریخ خواہ وہ رائج ہو یا متروک سند و مثال کے ذریعہ واضح کی جاتی ہے، اور ہر عہد کی مثالیں سنین اور حوالے کے ساتھ درج کی جاتی ہیں، اس طرح ابتک اردو میں جتنے لغت لکھے گئے ہیں، اس سے اس کے کام کی نوعیت بالکل علحدہ ہے، اگر اس کی تمام جلدیں شائع ہوگئیں تو اردو لغت نویسی کا ایک بڑا کام انجام پاجائیگا، اس اجتماع میں حقی صاحب بہت ہی اخلاق سے پیش آئے اور ترقی اردو بورڈ کے کاموں کو دیکھنے کی دعوت دی۔

(۷) مولانا رازق الخیری۔ اپنے مشہور اور یگانۂ روزگار والد بزرگوار جناب راشد الخیری صاحب مرحوم کے مشن کو پاکستان میں جاری کیے ہوئے ہیں، رسالۂ عصمت اسی شان سے نکال رہے ہیں جس طرح دہلی سے نکلا کرتا تھا، بوڑھے نظر آئے، لیکن باتوں میں ابھی جوان ہیں، آواز میں ابھی تک کراراپن ہے۔

(۸) پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۸ء و ۱۹۴۹ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں فیروز شاہ تغلق پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا تھا، اس کی ایک کاپی میرے پاس بھیجی تھی، اس کو پڑھکر مجھکو خیال ہوا تھا کہ یہ نوجوان مقالہ نگار آگے چل کر بہت ہی لائق اہل علم ہو سکتا ہے، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اب وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہیں اور وہاں عزت کی

نظر سے دیکھے جاتے ہیں، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی رہ چکے ہیں، وہاں سے انھوں نے دار المصنفین کے لیے پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل کے پرانے پرچے بھجوائے تھے، جو میرے علمی کاموں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے، ان سے غائبانہ تعارف تو تھا، اب ان سے ملا تو اور بھی خوشی ہوئی، انھوں نے اپنی یونیورسٹی میں مدعو کیا،

(۹) ڈاکٹر محمد صابر۔ کراچی یونیورسٹی میں ترکی زبان کے استاد ہیں، جس میں اچھی واقفیت رکھتے ہیں، ان کا ایک مضمون ترقی اردو بورڈ کے رسالہ اردو نامہ میں بابر کا فارسی، ترکی اور اردو کلام کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس کو میں نے دلچسپی سے پڑھا تھا، اس میں انھوں نے بابر کے بہت سے اشعار ایک ایسے دیوان سے نقل کیے تھے جو ان کو استانبول یونیورسٹی میں ملا تھا، ان سے ملتے وقت ان کا یہ مضمون نظروں کے سامنے رہا، ان ہی کے ساتھ جناب محمود حسن استاد اردو کراچی یونیورسٹی بھی تھے، انکا اصلی وطن رام پور تھا، ابھی جوان کیا نوجوان ہیں،

(۱۰) ابن انشاء صاحب۔ نیشنل بک سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں، اس ادارہ کا مقصد پاکستان میں کتابوں کی صنعت کو اچھی لکھائی، اچھی چھپائی اور اچھے گیٹ اپ کے ساتھ ترقی دینا، اور لوگوں میں خرید کر کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنا ہے، اس ادارہ کا تعلق غالباً یونسکو سے بھی ہے، دور جدید کے ترقی پسند شاعر اور ادیب ہیں، روزنامۂ جنگ کے کالم نویس بھی ہیں، بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھتے ہیں، کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں، جناب جمیل الدین عالی صاحب کے بڑے بے تکلف دوست ہیں، دونوں میں جب باتیں ہوتی ہیں تو دونوں کے فقروں اور جملوں میں شعر و ادب کا لطف آجاتا ہے، وہ بھی کراچی کی علمی مجلسوں کے سرگرم اور ممتاز رکن ہیں۔

(۱۱) خواجہ مشفق صاحب۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے روح رواں ہیں، اور بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق کے کاموں کو آگے بڑھانے میں بہت سرگرم ہیں، ان سے برابر خط و کتابت ہوتی رہی تھی،

یہ معلوم کرکے اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ دارالمصنفین کے بڑے قدردان خواجہ عبد الوحید صاحب سابق اڈیٹر الاسلام کے صاحبزادے ہیں،

(۱۲) مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب ۔ پاکستان کے بڑے مقبول اور قابل قدر مصنف ہیں، انھوں نے "شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات" کے علاوہ صوفیائے پنجاب، صوفیائے سندھ، صوفیائے سرحد اور صوفیائے بنگال لکھکر نہ صرف اپنے قلم کی برق رفتاری کا ثبوت دیا ہے، بلکہ ان صوفیائے کرام کی تعلیمات کو پاکستان کے لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ان کی خیر و برکت سے ضرور مستفیض ہو رہے ہوں گے، مولانا شاعر بھی ہیں، ان کی تمام تصانیف پڑھی تھیں، اس لیے ان سے بھی مل کر بڑی خوشی ہوئی،

(۱۳) ایوب قادری صاحب ۔ کراچی کے اردو کالج میں استاد ہیں، ان کی کتاب حضرت جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کو شوق سے پہلے پڑھ چکا تھا، ان کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی بڑی مہارت ہو گئی ہے، نواب صمصام الدین شاہنواز خاں کی مشہور تصنیف مآثر الامراء کی تمام جلدوں کا ترجمہ اردو میں کرکے علمی حلقہ میں وزن پیدا کر لیا ہے، اس وقت وہ نظام الدین احمد بخشی کی طبقات اکبری کی مختلف جلدوں کے اردو ترجمے میں لگے ہوئے ہیں، اب تک کئی کتابیں مثلاً وقائع عبد القادر خانی، کالا پانی، خطوط غالب، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مجموعہ وصایا اربعہ، عہد بنگش کی تاریخ، مولانا محمد احسن نانوتوی وغیرہ کے مصنف ہو چکے ہیں، جو کچھ لکھتے ہیں اس میں محنت و کاوش ہوتی ہے۔ لباس، وضع قطع اور گفتگو میں بہت سادہ اور سلیم الطبع معلوم ہوئے

(۱۴) ڈاکٹر شمین خاں صاحب ۔ پاکستان کے سرکاری محکمہ کاپی رائٹ بورڈ کے چیرمین ہیں، وہ اس لیے مدعو کیے گئے تھے کہ دار المصنفین کی مطبوعات کے کاپی رائٹ کے متعلق مفید مشورے دیں۔

ان حضرات کے علاوہ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے کچھ اور احباب، کراچی کے بعض ناشر و تاجر کتب اور اخبارات کے کچھ نامہ نگار بھی تھے، میں وہاں محبّ محترم جناب مبین الدین صاحب ممبر بورڈ آف ڈپٹی کلکٹر اعظم گڈھ، عزیزی افضال مبین الدین صاحب انجینیر سوئی گیس، ڈاکٹر سید

محمد شمیم (ڈھاکہ)، عزیزی صبیح محسن (انجینیر ریڈیو پاکستان) کے ساتھ پہنچا۔ ان کو بھی راشدی صاحب نے خاص طور پر مدعو کیا تھا، اس اجتماع میں پہلے سید حسام الدین راشدی صاحب نے دار المصنفین پر ایک تقریر کی اور پاکستان کے ناشر اس کی مطبوعات چھاپکر اس کو جو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے ہیں، اس کی طرف معزز حاضرین کی توجہ دلائی، یہ تقریر جیسے ہی ختم ہوئی جناب رازق الخیری صاحب جھلا اٹھے کہ آخر ہندوستان میں پاکستان کے مصنفوں خصوصاً ادارۂ عصمت کی جو کتابیں چھپ رہی ہیں ان کی بھی روک تھام کیجائیگی؟ ان کی اس جھلاہٹ پر ایک کھلبلی پیدا ہوئی، جب مجھ کو بولنے کیلئے کہا گیا تو میں نے رازق الخیری صاحب سے معذرت کی کہ ہندوستان میں بھی یہاں کی کتابیں ضرور چھپ رہی ہیں، لیکن میں نے معزز حاضرین کو مخاطب کرکے عرض کیا کہ میں یہاں دار المصنفین کے بہی خواہوں اور خیر خواہوں سے اخلاقی ہمدردی کا طالب بنکر آیا ہوں کہ اگر اس ادارہ کی کتابیں یہاں چھپتی رہیں تو یہاں کے ناشروں کو کچھ ذاتی فائدے تو ضرور حاصل ہو جائینگے لیکن دار المصنفین جیسا دیرینہ اور خدمتگذار ادارہ موت کے منہ میں آکر ختم ہو جائے گا، جو ایک بڑا علمی سانحہ ہوگا، اور جس کا ماتم پاکستان کے لوگ بھی دکھ اور درد کے ساتھ کرنے پر مجبور ہوں گے، کیونکہ اس ادارہ کے اخراجات زیادہ تر اسکی مطبوعات کی فروخت سے پورے ہوتے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ اس کا بجٹ ایک لاکھ سے کچھ اوپر کا بنتا ہے، اس کے مختلف شعبوں میں تقریباً چالیس آدمی کام کرتے ہیں، جو گذشتہ چھپن ۵۶ سال سے کبھی گراں قدر تنخواہوں کے خواہاں نہیں ہوئے، وہ صرف علمی خدمت کے جذبے میں اپنی زندگیوں کو یہاں وقف کیے ہوئے ہیں، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی جس تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کرکے اس ادارہ کو فروغ دینے کی کوشش میں لگے رہے، اس کی تفصیل بھی بتائی اور عرض کیا کہ اس ہوش ربا گرانی میں بھی ان کے شاگرد ان ہی کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے ہیں، میری باتوں کو معزز سامعین نے غور سے سنا، اور دار المصنفین سے ہمدردی ظاہر کی، پھر اس پر بحث شروع ہو گئی کہ اس کی مطبوعات کی دستبرد کو

کیسے رد کیا جاسکتا ہے، اس میں جناب ممتاز حسن صاحب، جمیل الدین عالی صاحب، الطاف حسین بریلوی صاحب، ڈاکٹر معین الحق صاحب اور ابن انشاء صاحب نے پورا حصہ لیا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ دارالمصنفین کے علمی کاموں کے بڑے قدردان ہیں، بالآخر یہ طے پایا کہ مزید غور و فکر کے لیے اسی اجتماع میں سے ایک کمیٹی بنا دی جائے، اس کے ارکان جناب ممتاز حسن، جناب سید حسام الدین راشدی، جناب جمیل الدین عالی، جناب ابن انشاء، اور جناب ابن الحسن منتخب ہوئے، اس کے بعد یہ مجلس ختم ہوئی، اس کی دلچسپ، پرکیف اور خوشگوار یادوں کا چراغ ابھی تک آنکھوں کے سامنے روشن ہے، اس کے لیے جناب راشدی صاحب کا جتنا بھی زیادہ شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

اس کمیٹی کی نشست جناب ممتاز حسن صاحب کے دفتر نیشنل بک ٹرسٹ میں ہوئی، اور اس میں یہ طے پایا کہ دارالمصنفین سے باضابطہ اختیارات لیکر ایسے ناشرین کے خلاف قانونی کارروائی کیجائے جو اس کی مطبوعات بلا اجازت چھاپ کر اس کو نقصان پہنچاتے ہیں، راقم نے یہ اختیارات جناب ابن الحسن صاحب کو تفویض کیے، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان سے پوری امید ہے کہ اپنے والد بزرگوار جناب ظہور الحسن صاحب سابق رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کے ساتھ اس ادارہ کے مطبوعات کے حقوق کی نگہداشت کرتے رہیں گے۔

اسی نشست میں اس کمیٹی کے اراکین نے اپنے طور پر ایک سوسائٹی کی بھی تاسیس کی جس کا نام شبلی و سلیمان یادگار سوسائٹی رکھا گیا، اس کا مقصد مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کا فروغ دینا قرار پایا، اس کے صدر جناب ممتاز حسن صاحب، سکریٹری جناب ابن الحسن صاحب، خازن جناب جمیل الدین عالی صاحب مقرر ہوئے، اور اراکین جناب سید حسام الدین راشدی (کراچی) مولانا عبدالوہاب جمال الدین (ڈھاکہ)، پروفیسر حمید احمد (لاہور)، حکیم سعید احمد (کراچی) حبیب احمد صدیقی اور ظہور الحسن صاحبان منتخب ہوئے، ہندوستان و پاکستان کے سیاسی

تعلقات اس وقت خوشگوار نہیں ہیں لیکن آیندہ جب خوشگوار ہوں گے اور ہونے چاہئیں، تو پھر ہم ثقافتی طور پر اس سوسائٹی سے بھی امید رکھیں گے کہ یہ ہندوستان میں شبلی و سلیمان کے ادارہ کی مطبوعات کے حقوق کی پامالی پاکستان میں نہ ہونے دے گی۔

ایک روز شان الحق حقی صاحب کی دعوت پر اردو ترقی بورڈ کے دفتر بھی گیا جو شمالی ناظم آباد میں ہے، ابھی کرایہ کی عمارت میں ہے جو بہت اچھی معلوم ہوئی، معلوم ہوا کہ حکومت اس ادارہ کو کبھی سوا لاکھ اور کبھی دو لاکھ امداد دیتی ہے، حقی صاحب نے بورڈ میں لغت پر جس طرح کا کام ہوتا ہے اس کی تفصیل بتائی، الفاظ اکٹھے کر کے ان کی تشریح و تصریح جس طرح کیجاتی ہے اور انکو جس طریقہ سے مختلف خانوں میں رکھا جاتا ہے، وہ بھی دکھایا، اسکی طرف سے بچوں کے لیے کارآمد کتابیں بھی چھاپ کر فراہم کیجاتی ہیں، اردو کے جن مشہور مصنفوں کی کتابیں عام طور سے بازاروں میں نہیں ملتی ہیں، ان میں سے بعض کتابیں بھی یہاں سے شائع ہوگئی ہیں، اس سلسلہ میں محمد حسین آزاد کی اردو کی پہلی کتاب کے مختلف حصے، ڈاکٹر نذیر احمد کی مرأۃ العروس اور منتخب الحکایات، راشد الخیری کی منازل السائرہ اور میر امن کی باغ و بہار دیکھنے میں آئیں، ان کے علاوہ جذبات نادر خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں ممتاز حسن صاحب کا ایک بہت ہی پرمغز مقدمہ ہے، شیخ نادر علی عباسی کاکوری کے رہنے والے تھے، ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں وفات پاگئے، اس طرح کل ۴۵ برس کی عمر پائی، ان کی زندگی میں ان کا مجموعۂ کلام جذبات نادر کے نام سے نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا جس کے شروع میں عزیز مرزا، قاضی تلمذ حسین اور عبد الحلیم شرر کی مختصر تقریظیں تھیں، لیکن ان ارباب نظر کے خراج تحسین کے باوجود شعر و شاعری کے نقادوں نے ان کو وہ جگہ نہیں دی تھی جس کے وہ مستحق تھے، اس کی تلافی جناب ممتاز حسن صاحب نے ان کے مجموعۂ کلام پر ایک بسوط مقدمہ لکھکر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حالی اور آزاد نے جس شاعری کو نیچرل بنا دیا تھا، نادر نے اس میں فطری جذبات اور ایک دلچسپ طرز ادا کا

اضافہ کیا، نادر بلا شک وشبہ حالی اور آزاد کی تحریک کے گل سرسبد ہیں، ممتاز حسن صاحب انکی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں: اس میں کچھ شک نہیں کہ نادر ایک طرز کے موجد تھے جو انگریزی شعراء کے بیان سے قریب تھی، ان کا مقصد شعر کے ذریعے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنا تھا، نہ کہ رسمی اردو شعراء کی طرح محض ردیف اور قافیوں میں لفظی اور صوتی ہم آہنگی پیدا کرنا، ممتاز حسن صاحب نے نادر کی ان نظموں کی بہت تعریف کی ہے جو ٹنیسن، بائرن اور ٹامس مور کی نظموں کے ترجمے ہیں، اس مقدمہ کے بعد نادر کاکوروی کی شاعری نہ صرف ایک بار پھر نظروں کے سامنے آگئی ہے، بلکہ ان کو شہرت عام اور بقائے دوام بھی حاصل ہو جائے گی،

جناب شان الحق حقی صاحب دار المصنفین کے لیے اپنے ادارہ کی مطبوعات ہدیے کے طور پر دے رہے تھے، لیکن ان کا لانا مشکل تھا، اس لیے ان سے معذرت خواہ ہوا، یہاں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، اور جناب سید یوسف بخاری بھی کام کرتے ہیں، میں دیر کر کے دفتر میں پہنچا، اس لیے وہ سب اٹھ چکے تھے، ان سے نہ ملنے کا افسوس ہے، یہیں جلال احمد صاحب ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن سے ملاقات ہو گئی جو جناب رشید احمد صدیقی صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے بھانجے اور جناب بشیر احمد صدیقی صاحب سابق پرنسپل شبلی نیشنل کالج اعظم گڈھ کے داماد ہیں، ان سے اچانک مل کر بڑی خوشی ہوئی، وہ مختلف قسم کے معلومات کے خزانہ ہیں اور بڑی اچھی گفتگو کرتے ہیں، انھوں نے اپنی سعادت مندی سے ڈاکٹر محمد عزیر (سابق رفیق دار المصنفین وریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی) کے یہاں پہنچایا، جن کے یہاں پہنچکر اخلاص ومحبت کے جام پی کر سرشار رہا، جلال میاں کے ساتھ بشیر احمد صدیقی صاحب کے گھر پر بھی گیا، جو پاکستان جانے سے پہلے دار المصنفین کی نجی مجلسوں کی بساط صحبت احباب میں جلوۂ لالہ وگل بن کر شریک ہوتے تھے، وہ عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے ہوئے تھے، ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن انکے گھر پہنچکر بیس برس پہلے کے نشاط اور فرخندہ دونوں کو آواز دینے کو جی چاہا، ان کے لائق لڑکوں کو دیکھ کر ان کے بچپن کا زمانہ یاد آیا، جب وہ اعظم گڈھ کی گلیوں میں کھیلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، ان میں اب ہر ایک اچھی ملازمت پر ہے

ایک روز جناب جمیل الدین عالی صاحب کی دعوت پر اردو کالج کی نئی عمارت کے افتتاح کی تقریب میں بھی شریک ہوا، بابائے اردو کی کوششوں سے انجمن ترقی اردو کی نگرانی میں اردو کالج قائم ہوا تھا، اس میں یونیورسٹی کی ساری تعلیم اردو کے ذریعہ دیجاتی ہے، اسکے آرٹ اور کامرس کے شعبے تو ابھی انجمن ترقی اردو کے دفتر کیساتھ ہیں لیکن سائنس کے شعبے کیلیے کراچی کی آبادی سے دور ایک بڑی نئی عمارت بنگئی ہے، جو کراچی یونیورسٹی کے راستے میں ہے، سید حسام الدین راشدی صاحب کیساتھ میں رسم افتتاح کی تقریب میں پہنچا تو وہاں بہت سے ممتاز لوگ موجود تھے، جن میں انجمن ترقی اردو کے صدر جناب اختر حسین صاحب بھی تھے جو علی گڈھ کے اولڈ بوائے ہیں، اور مغربی پاکستان کے گورنر بھی رہ چکے ہیں، اور حضرات کے ساتھ ان سے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، یہاں رسم افتتاح میں قرآن خوانی ہوتی ہے، تمام حاضرین کے ساتھ جناب اختر حسین صاحب بھی اور لوگوں کی طرح فرش پر بیٹھکر قرآن مجید پڑھتے رہے، قرآن خوانی کے بعد جمیل الدین عالی صاحب نے اپنی تقریر میں اردو کالج کی عمارتی تعمیر کی تفصیل بتائی، پھر یکایک مجھکو مجمع سے مخاطب ہونے کو کہا، مجھسے جو کچھ بن پڑا اردو زبان کی اہمیت اور اردو کالج کی ضرورت پر کچھ دیر تک بولتا رہا۔

اسی تقریب میں اردو کے مشہور نقاد ممتاز حسین جونپوری سے ملاقات ہوئی جو اردو کالج میں شعبہ اردو کے صدر ہیں، ان کے مضامین کے مجموعے نقد حیات، نئی قدریں اور نئے تنقیدی گوشے میری نظر سے گذرے ہیں، وہ شعر وادب پر اپنی تنقیدوں کا اظہار مارکسی نظریے کے ماتحت کرتے ہیں، مگر وہ قدیم ادب کی تمام روایتوں کے باغی بھی نہیں ہیں، بلکہ اس کی صدیوں کے ست اور امرت کو نئی صحت مند ادبی تحریکوں کے ساتھ ملانے کے خواہاں ہیں تاکہ ان کے خیال کے مطابق ایک نیا جمالیاتی ذوق ایک نئی نفسیات کے ساتھ میل کھا سکے، البتہ ان کا یہ پیام ذرا غور طلب ہے کہ ہندوستانی عورتیں (جن سے پاکستانی عورتیں بھی مراد لی گئی ہوں) اپنی نظر بجائے انگلینڈ اور امریکہ کے روس کی طرف لیجائیں تو اسے ایشیا کی روح اور پابند آزادی کا امتزاج دعوت نظر دیتا نظر آئے گا، ان سے ملا تو ان کی سادگی، متانت اور خاموشی سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر مارکسی نظریے کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں، انھوں نے اپنا تعلق محمد آباد ضلع اعظم گڈھ سے بھی بتایا۔

کراچی یونیورسٹی کے بعض اساتذہ کی دعوت پر ایک روز وہاں بھی گیا جو شہر سے بہت دور ہے، اسکی عمارت بہت ہی شاندار ہے، اسکی تعمیری شان بالکل مختلف نظر آئی، معلوم ہوا کہ اسکا نقشہ کسی فرانسیسی ماہر تعمیرات نے بنایا تھا، اسلیے فرانسیسی ذوق زیادہ نمایاں ہے، ہر جگہ بڑی وسعت اور کشادگی ہے، یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر محمود حسین صدر شعبۂ تاریخ اپنے کمرہ میں لے گئے، وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں، اس خاندان کو دار المصنفین سے گہرا لگاؤ رہا ہے، اسلیے توقع کے مطابق ڈاکٹر محمود حسین بڑے اخلاق سے پیش آئے، ان کے کمرہ میں یونیورسٹی کے اور اساتذہ بھی آگئے تو ان سب سے ملاقات ہو گئی، دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ اردو میں اپنی مہارت کا ثبوت روسو کی مشکل کتاب سوشل کنٹریکٹ کا ترجمہ معاہدۂ عمرانی کے نام سے کرکے دیا ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے جو انگریزی تاریخ "ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ" کے نام سے لکھی جا رہی ہے، اس کے بورڈ کے بھی صدر ہیں، اس سلسلہ کی پہلی دوسری جلدوں میں ان کے کئی ابواب ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید بریلویؒ وغیرہ پر ہیں، انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی کی طرح ملیر کراچی میں ایک جامعہ ملیہ قائم کی ہے، مجھکو اس کو دیکھنے کی دعوت دی لیکن افسوس ہے کہ اپنی کوشش کے باوجود وہاں نہ پہنچ سکا، اس روز ڈاکٹر ریاض الاسلام کسی ضرورت سے یونیورسٹی سے باہر تھے، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر شعبۂ اردو اس روز یونیورسٹی نہیں آئے تھے لیکن ان کے شعبہ کے اور اساتذہ سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ اردو کے ایم، اے فائنل کلاس میں تقریباً ایک سو طلبہ ہیں، اتنی بڑی تعداد کراچی ہی میں ہو سکتی ہے، شعبہ میں صرف چھ اساتذہ کام کرتے ہیں، جو علی گڈھ یونیورسٹی کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، یونیورسٹی کا کتب خانہ بھی دیکھنے گیا، جہاں ایک اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے مولوی فضل اللہ ندوی صاحب بھی کام کرتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ کتب خانہ میں سوا لاکھ کتابیں ہیں جن میں پچاس ہزار عربی، فارسی اور اردو کی ہیں، یہیں عبد الحلیم چشتی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو معارف میں کبھی کبھی مضامین لکھا کرتے ہیں، اس میں ان کا ایک بہت اچھا مضمون امام صغانی پر شائع ہوا تھا،

اس کے طرز تحریر کو دیکھکر میں ان کو مسن آدمی سمجھتا تھا لیکن وہ ابھی نوجوان تو نہیں مگر جوان ہیں، ان سے میں نے کہا کہ وہ اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھیں، اور قلم میں جو فطری قوت پائی ہے، اس کا اچھا مصرف لیتے رہیں، اردو شعبہ کے استاد محمود حسن صاحب رامپوری برابر ساتھ رہے، یونیورسٹی میں تعلیم مخلوط ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کو بہت بے تکلفی سے ایک دوسرے سے ملتے دیکھا، معلوم نہیں اس بے تکلفی میں اسلامی قدریں باقی ہیں کہ نہیں، اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔

یونیورسٹی میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سے ملاقات ہو گئی جو کسی کام سے وہاں آئے ہوئے تھے، اب وہاں سے ریٹائر ہو چکے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت سے ملے، اس لیے کہ ان کی ایک کتاب "خلافت و سلطنت" دار المصنفین سے شائع ہوئی تھی، جو استاذی المحترم حضرت سید سلیمان ندوی رحمہ کو پسند تھی، وہ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں، لندن سے مذکورۂ بالا کتاب پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، وہاں سے آنے کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک لکچرار رہے، جس کے بعد وہ کراچی چلے آئے، یہاں انھوں نے سندھ مسلم کالج کی بنیاد ڈالی، اس کے پرنسپل ۱۹۴۷ء تک رہے، پھر کراچی ہی میں اسلامیہ کالج قائم کرکے وہاں کے پرنسپل ۱۹۵۰ء تک رہے، اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے شعبہ کے صدر ہو گئے اور پھر فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی ہوئے، ۱۹۵۹ء میں اسٹریلیا جا کر اسلامی تاریخ پر کئی لکچر دیے، ۱۹۶۴ء میں فلپائن وزیٹنگ پروفیسر ہو کر گئے، کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، آج کل اپنے ادارہ جمعیۃ الفلاح کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، جہاں سے اپنی نگرانی میں وائس آف اسلام ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے ہیں، اس میں خالص اسلامی نقطۂ نظر کے مضامین شائع ہوتے ہیں، یہ ۱۹۵۲ء سے برابر نکل رہا ہے، وہ مجھ سے ملے تو انکے ہینڈ بیگ میں ان کی تازہ انگریزی تصنیف "غیر مسلم مسلمان حکومت میں اور مسلم غیر مسلم حکومت میں" تھی، مجھکو نکالکر دی اور خاکساری میں کہا کہ دار المصنفین کے معیار کے مطابق تو نہیں ہے، لیکن اس کو ضرور پڑھیے، میں ان ہی

کے ساتھ یونیورسٹی سے واپس ہوا، انھوں نے بہت اصرار کر کے جمعیۃ الفلاح کے دفتر میں بلایا، جو ۲۰ فرید کوٹ روڈ پر ہے، ایک روز مولانا شبلی مرحوم کے بھتیجے حاجی انور نعمانی صاحب (بن محمد جنید مرحوم) کے ساتھ اس دفتر میں پہنچا، جس کو دیکھ کر ڈاکٹر امیر حسن صاحب کے اسلام کے جذبۂ خدمت سے بہت متاثر ہوا، دفتر کی عمارت بڑی صاف ستھری ہے، ہر کمرہ میں موزیک کا فرش ہے، معلوم ہوا کہ پوری عمارت تین لاکھ میں بنی ہے، ہر کمرہ میں ساری چیزیں بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں، اخبارات و رسائل کے فائل بھی اہتمام کے ساتھ رکھے ہوئے تھے، ڈاکٹر امیر حسن صاحب کے کوئی اولاد نہیں، اسی ادارہ کو اپنی اولاد بنائے ہوئے ہیں، اور تن من دھن سے اس کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں، دفتر تو اوپر کوٹھے پر ہے، نیچے کمروں میں دکانیں ہیں، جن سے کافی آمدنی ہے، ادارہ کے اخراجات میں اس آمدنی سے بڑی مدد ملتی ہوگی، اس کی طرف سے اب تک ۲۱ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو زیادہ تر انگریزی میں ہیں، ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے صحیح تصورات لوگوں خصوصاً غیر مسلموں کے سامنے پیش ہوتے رہیں، خود ڈاکٹر امیر حسن کی جو کتابیں یہاں سے شائع ہوئی ہیں ان کے نام یہ ہیں:- (۱) ایران کے ازمنۂ وسطیٰ میں خلافت و سلطنت (۲) مسلم ادارے کی ابتدا اور ان کا ارتقا (۳) اسلامی تاریخ کا مطالعہ (۴) مشاہیر اسلام حصہ اول و دوم (۵) مسلم سپہ سالار (۶) اسلامی ریاست (۷) غیر مسلم مسلمان حکومت میں اور مسلم غیر مسلم حکومت میں، یہ سب انگریزی میں ہیں، ان کے اردو ترجمے بھی کئے گئے ہیں، یہاں سے انگریزی کی اور دوسری مطبوعات جو شائع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں: (۸) سیرۃ النبی جلد اول کے مقدمہ کا انگریزی ترجمہ از محمد طیب (۹) پیغمبر اسلام از خورشید احمد (۱۰) مسلمانوں کا معاشرتی فلسفہ از ڈاکٹر بشارت علی (۱۱) کلام پاک کا تعارف از خورشید احمد (۱۲) تقابلی عمرانیات از ڈاکٹر بشارت علی (۱۳) معاشرتی فلسفہ میں شاہ ولی اللہ کے کارنامے از ڈاکٹر بشارت علی (۱۴) قرآن اور حدیث کی بنیادی تعلیمات از نثار احمد، اردو میں شائع کردہ مطبوعات کے نام یہ ہیں: (۱۵) خلافت و سلطنت (۱۶) مسلم تعصبات (۱۷) اسلامی تاریخ (۱۸، ۱۹) مشاہیر اسلام حصہ اول و دوم (۲۰) اسلامی تاریخ۔ یہ کتابیں ڈاکٹر امیر حسن کی انگریزی تصانیف کے ترجمے ہیں (۲۱) سیرت پاک

از خورشید احمد اور احمد انس (۲۲) نوائے سروش از نثار احمد (۲۳) صاحب رحمت از نثار احمد۔

دفتر میں درانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو رسالہ وائس آف اسلام کو ترتیب دیتے ہیں، انھوں نے خود بیان کیا کہ وہ پہلے عیسائی تھے، لیکن اب مسلمان ہو کر اسلام کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، قادیانیوں کے بڑے مخالف تھے، کہتے تھے کہ ان کے خلاف ایک عالمگیر تحریک اٹھانے کی ضرورت ہے، وائس آف اسلام میں اسلامی ممالک کے اتحاد پر زور دیا جاتا ہے، خود ڈاکٹر امیر حسن اپنی تحریروں میں اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ اگر ایک اسلامی بلاک بن گیا تو وہ سرمایہ داری اور کمیونزم کے دونوں بلاکوں کے درمیان توازن پیدا کرتا رہے گا، اور اسلامی بلاک کے ذریعہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا تحفظ بھی کیا جا سکتا ہے،

اسی روز خواجہ مشفق صاحب کی دعوت پر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں گیا، مولانا شبلی نعمانی کے بھتیجے انور نعمانی صاحب ساتھ تھے، ان سے بھی لوگ بڑی محبت سے ملے، اس دفتر کی عمارت میں اردو کالج بھی ہے، جس میں آرٹس اور کامرس کے شعبے ہیں، خواجہ مشفق صاحب ابھی بالکل جوان ہیں، مگر انجمن کے روح رواں بنے ہوئے ہیں، انھوں نے اس کی تمام چیزیں بہت شوق سے دکھائیں، اس کے علمی کارنامے روز روشن کی طرح ظاہر ہیں، وہ کہتے تھے کہ اس کی مطبوعات کی سالانہ فروخت ستر اسی ہزار تک ہو جاتی ہے، حکومت کی طرف سے بھی امداد ملتی ہے، یہاں میں ۱۹۵۵ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق سے آکر ملا تھا، ان کی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں، انھوں نے اثنائے گفتگو میں کہا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں تو اردو کیلئے مہا بھارت کی جنگ کرتا اور بھیم و ارجن کی طرح لڑتا رہا، یہاں بھی اردو کیلئے لڑتا ہوں لیکن اپنوں سے جنگ کرتے بن نہیں پڑتی، پھر بھی انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کالج کی بنیاد ڈال دی تھی، جو اب کافی ترقی کر چکا ہے، انجمن کے دفتر میں جناب جلیل قدوائی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، ان کے افسانوں کے مجموعے اصنام خیالی اور مونا دوا اپنی طالب علمی کے زمانے میں پڑھے تھے، اس وقت سے ان کو جانتا ہوں، اور جب کبھی ان کی کسی تحریر پر نظر پڑتی ہے تو خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے، ان سے مل کر خوشی ہوئی، میں تو اب بوڑھا ہو رہا ہوں لیکن وہ جوان ہی نظر آئے، وہ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر بھی رہ چکے ہیں، شاعر بھی ہیں، ان کی نظموں کے مجموعے

کا نام نقش و نگار ہے، اس کے علاوہ دیوان بیدل، انتخاب حسرت، کلام غالب، تنقیدیں اور غالب کے تذکرے اور
تبصرے، نوائے سینہ تاب، کارنامۂ ادب کے مرتب اور مصنف بھی ہیں، اصلی وطن اناؤ تھا، پاکستان کی حکومت کے
شعبۂ تعلقات عامہ اور وزارت اطلاعات میں ملازمت کرکے اب پنشن پاچکے ہیں، مگر اب بھی علمی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

کراچی کے قیام میں ابو سعادہ صاحب برابر ساتھ رہے، وہ پاکستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات کو زیادہ
سے زیادہ عام کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں، جناب ایوب قادری صاحب استاد اردو کالج کے بھائی ہیں،
ایک روز انھوں نے کہا کہ یہاں کے ایک بہت ہی معزز صنعت کار حاجی محمد عمر صاحب بڑے علم دوست ہیں،
اور دارالمصنفین کے بڑے قدرداں ہیں، وہ مجھ سے ملنے کے خواہاں ہیں، میں ان کو پہلے سے نہیں جانتا تھا، ابو سعادہ صاحب
مجھ کو ان کی کوٹھی پر لے گئے، جو بہت بڑی اور نہایت آراستہ و پیراستہ تھی، اس کے ایک بڑے ہال میں بہت اچھا
کتب خانہ تھا جس کی تمام کتابوں میں بہت عمدہ جلدیں بندھی تھیں اور الماریوں میں بہت سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں، حاجی محمد عمر صاحب
خود تو اب کاروبار نہیں کرتے ہیں، سب کچھ اپنے لڑکوں کو حوالہ کر دیا ہے، کتب خانہ میں بیٹھ کر اپنی علمی تشنگی
بجھاتے رہتے ہیں، مجھ سے بڑے اخلاق سے ملے، میری تمام ناچیز تصانیف میرے سامنے لاکر رکھ دیں کہ میں
ان پر دستخط کر دوں، مجھ کو حیرت تھی میری کوئی ایسی تصنیف نہیں تھی جو ان کے پاس نہ تھی، کچھ دیر کے بعد
اٹھ کر چلے گئے، اور واپس آئے تو ایک ہزار روپئے پیش کئے، اور فرمایا کہ میں اس کو اپنے سفر میں خرچ کروں، میں
اس اخلاص اور قدردانی سے بے حد متاثر ہوا، میں نے ان سے کہا کہ یہ رقم یہیں جمع رہنے دیں، جب دونوں
حکومتوں میں مالی لین دین ہوگا تو آپ دارالمصنفین کے لائف ممبر بن جائیں، انھوں نے کہا کہ یہ رقم تو وہ نکال
چکے ہیں، اب میں جو چاہوں اس سے مصرف لوں، انھوں نے بہت اصرار کرکے یہ رقم دیدی جو وہیں جمع ہے۔

ایک روز ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر گیا، جو خیابان سرسید (سرسید روڈ) پر واقع ہے، اسی کے سامنے
سرسید گرلس کالج ہے، جس میں آرٹس اور سائنس کے شعبے ہیں، معلوم ہوا کہ اس میں پندرہ سو لڑکیاں تعلیم
پاتی ہیں، اس کی عمارت چھ ایکڑ زمین پر تقریباً بیس لاکھ روپئے میں تعمیر ہوئی ہے، شاید پردہ کے خیال سے

عمارت چار دیواری سے گھری ہوئی تھی، اس کے اندر اسمبلی ہال، لائبریری، جمنازیم اور ایک مسجد بھی
بننے والی ہے، جس میں مزید تیس لاکھ روپئے خرچ ہوں گے، پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں
سے یہ کالج قائم ہوا ہے، جو اس کا بڑا کارنامہ ہے، لیکن خود کانفرنس کی عمارت ابتک نہیں بنی ہے،
اور یہ ایک کرایہ کی عمارت میں ہے، جناب الطاف بریلوی صاحب نے اس کے تمام کمرے دکھائے
ایک کمرہ میں اردو کے تمام مصنفوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں، جس سے ایک نظر میں وہ سب سامنے
آجاتے ہیں، جناب بریلوی صاحب نے کانفرنس کی مطبوعات بھی دکھائیں، ان میں سے دو میں نے
اپنے لیے منتخب کیں، ایک تو استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی کے ایک اردو مقالہ کا انگریزی
ترجمہ دی ایجوکیشن آف ہندوز انڈر مسلم رول تھا، اور دوسرا العلم کا غالب نمبر تھا، میں نے جناب
بریلوی صاحب سے عرض کیا کہ میں نے بھی سید صاحب کے اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، جو ۱۹۳۸ء اور
۱۹۳۹ء میں حیدرآباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں متعدد قسطوں میں شائع ہوا تھا، العلم کا
غالب نمبر ۲۰×۳۲ سائز میں ۴۳۲ صفحے پر مشتمل ہے، ایسے ضخیم نمبر ہندوستان اور پاکستان سے
معلوم نہیں کتنے نکل چکے ہیں، پھر بھی نکلتے رہیں گے، یہ غالب کی ذات اور ان کی شاعری دونوں کی
کرامت ہے، گذشتہ سو سال سے ان پر برابر کتابیں اور مضامین شائع ہو رہے ہیں، پھر بھی غالب پر
لکھنے والوں کو کوئی نہ کوئی نیا موضوع مل جاتا ہے، اس غالب نمبر میں جہاں غالب کے تصوف، مسائل حیات
اور فلسفہ پر مضامین ہیں، وہاں ان کے علم نفسیات، علم نجوم اور علم کلام پر بھی مقالے ہیں، ایک مضمون غالب
اور گوئٹے کے عنوان سے ۴۶ صفحے میں ہے، جو اس نمبر کا طویل ترین مقالہ ہے، اقبال نے غالب کو خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے   گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

یہ مضمون اس شعر کے متن کی شرح ہے، مضمون نگار کا خیال ہے کہ گوئٹے اور غالب دونوں صاحبان عینیت

دونوں کا فلسفۂ نجات بھی ہم رنگ ہے ...... دونوں اپنی اپنی جگہ صناع اعظم ہیں ...... الخ

اس قسم کے موازنے میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن گوئٹے کی فاؤسٹ کی تمام باتوں کو غالب کی شاعری میں ڈھونڈ نکالنا اگر ستم نہیں تو عقیدت بالائے عقیدت ضرور ہے۔

اس نمبر میں پروفیسر ممتاز حسین صدر شعبۂ اردو کالج کا بھی ایک مضمون غالب کے عنوان سے ہے، اس میں انھوں نے اپنے اور مضامین کی طرح غالب کو مارکسی عینک سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اس میں مختصر طریقہ پر غالب کے کلام کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے، لیکن وہ غالب کی پہلودار شخصیت کی خوبیاں بتاتے ہوئے یکایک یہ دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ جس طرح یورپ میں یونانی علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ کی روشن خیالی نے لوتھر کی مذہبی اصلاحی تحریک کے لیے راہ ہموار کی، اسی طرح ہمارے یہاں غالب کی روشن خیالی نے سرسید کی مذہبی اصلاح کے لیے راہ ہموار کی (ص ۶۶)، اس رائے میں بالغ نظری نہیں، لائق مضمون نگار کا عقیدت مندانہ جوش ان کے ناقدانہ ہوش پر غالب آگیا ہے۔

اس نمبر میں بعض مطبوعہ مضامین بھی شامل کر دیے گئے ہیں، اسی لیے اس کی ضخامت فاضل اڈیٹر صاحب کے قول کے مطابق قبل تہذیب کی زلف محبوب کی طرح بڑھتی چلی گئی، مگر ان کی رائے سے اتفاق ہے کہ یہ نمبر خاصے کی چیز بن گیا ہے، شروع میں غالب پر پاکستان کے بعض مشاہیر کے دلچسپ انٹرویو بھی ہیں، ممتاز حسن صاحب غالب کے بڑے پرستار ہیں، انھوں نے اپنے انٹرویو میں فرمایا ہے کہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

اس فلسفیانہ شعر کا جواب نہ صرف اردو بلکہ شاید دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ سید حسام الدین راشدی صاحب نے اپنے انٹرویو میں جہاں اور باتیں کہی ہیں وہاں یہ بھی کہا ہے کہ اب تک غالب پر جو تحقیقی سرمایہ موجود ہے وہ یورپین انداز تحقیق کے معیار پر نہیں اترتا، اس لیے یورپ کے محقق اگر غالب کے سوانح اور کوائف زندگی پر لکھنا چاہیں تو یہ سرمایہ ان کے کام نہیں آسکتا ...... اڈیٹر صاحب کو اعتراف ہے کہ

اس پر بہار گلدستۂ غالب کو سج سجا کر پیش کرنے کا کریڈٹ جناب محمد ایوب قادری صاحب کو حاصل ہے، جو علمی کاموں میں محنت شاقہ کرنے کے عادی ہیں۔

ایک روز پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی بھی گیا، ۱۹۵۵ء میں بھی یہاں آیا تھا، اس وقت سے اب تک یہ سوسائٹی بہت ترقی کر گئی ہے، اس کا کتب خانہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیے، پھر بھی اس میں اچھا ذخیرہ نظر آیا، یہ اپنی قابل قدر مطبوعات کی وجہ سے پاکستان میں ایک مقام حاصل کر چکی ہے، اس کی مطبوعات کا ذکر پہلے آچکا ہے، ڈاکٹر معین الحق صاحب کی خواہش تھی کہ میں سوسائٹی کے ایک جلسہ میں اپنا کوئی مقالہ پڑھوں، لیکن میں نے معذرت کی کیونکہ میرے پاس وہاں کوئی ایسا مقالہ نہ تھا، میرا ایک مضمون "ملفوظات خواجگان چشت" کے عنوان سے معارف کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہیے، تاکہ پروفیسر محمد حبیب نے ان ملفوظات کو جعلی قرار دے کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے، اس کا ازالہ انگریزی داں حلقہ میں بھی ہو جائے۔

پاکستان ریڈیو کراچی اسٹیشن والوں کی خواہش ہوئی کہ اس پر میری کوئی تقریر ہو جائے، میں تقریر کرنے سے گھبرایا، تو انھوں نے خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ میں صرف دار المصنفین کے علمی کاموں پر روشنی ڈالوں، اور اسکی نوعیت انٹرویو کی شکل میں ہو، اس پر میں راضی ہو گیا، وہ مجھے ریڈیو اسٹیشن لے گئے، براڈکاسٹ روم میں مجھ سے دار المصنفین کے متعلق سوالات کرتے تھے اور میں ان کو جوابات دیتا تھا، یہی انٹرویو ریکارڈ ہوا،

میرے کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے جناب جمیل الدین عالی صاحب نے ایک رات کو اپنے یہاں کھانے کے بعد ایک مخصوص نشست کی جس میں جناب ممتاز حسن صاحب، سید حسام الدین راشدی صاحب، ابن انشا صاحب اور محمود قاسم صاحب تھے، یہ دلچسپ اور پر لطف صحبت بارہ بجے رات تک رہی، موضوع زیادہ تر علم، ادب اور تصوف رہا، ممتاز حسن صاحب بڑی اچھی گفتگو کرتے ہیں، ان کے دائرۂ گفتگو میں شکسپیر، برٹرنڈ رسل، برنارڈ شا، ٹی ایس ایلیٹ، چرچل، کننگھم سے لیکر غالب، اقبال، حالی، شبلی، حسرت سب ہی آئے، وہ اپنی علمی گفتگو

اپنے لطیف و نشاط انگیز انداز بیان اور مزاحیہ فقروں سے دلچسپ بنا دیتے ہیں، اور پھر اسکے متوقع نہیں رہتے کہ ان کی بزرگی، بڑائی اور کبرسنی کے بارے ان کے مخاطب دبے رہیں، اسی لیے ان کے معاصر خواہ انکے ہمسن ہوں یا ان سے چھوٹے ہوں ان کی بہت عزت کرتے ہیں اور بے حد محبت بھی جمیل الدین عالی صاحب کی باتوں میں بڑی ذہانت پائی جاتی تھی، کوئی بھی موضوع ہوتا، اس میں اپنی خداداد ذہانت سے کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکال دیتے، یورپ کی مختلف ادبی اور سیاسی تحریکوں پر انکی نظر اچھی ہے، انکی باتوں میں جان اس وقت پیدا ہوجاتی جب انکے دوست ابن انشا صاحب ان پر کوئی فقرہ چست کردیتے، اس کے جواب میں جمیل الدین عالی صاحب کی ذہانت کی رگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھتی، ان کا خاندان لوہارو کا رہنے والا تھا، انکی بیگم صاحبہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے خاندان کی ہیں جس کے بعد گھر کی زبان اور تہذیب کے متعلق کچھ لکھنا لاحاصل ہے، ابن انشا صاحب زیادہ تر مجھ سے دارالمصنفین سے متعلق سوالات کرتے رہے، سید حسام الدین راشدی صاحب تو دارالمصنفین کے نام اور اس کے کام پر ہر لمحہ نچھاور ہونے کے لیے تیار رہتے، ممتاز حسن صاحب کا یہ فقرہ ابھی تک دل کے کانوں میں گونج رہا ہے "ہندوستان کے تین ادارے اپنی خدمت اور ایثار کے لحاظ سے برابر یاد کیے جائیں گے، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی پونا، دارالمصنفین اعظم گڈھ، اور جامعہ ملیہ دہلی، گو جامعہ ملیہ دہلی کی حیثیت اب بدل گئی ہے، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کا حال تو اب معلوم نہیں، لیکن دارالمصنفین اپنی روش پر قائم ہے"، ابن انشا صاحب نے شاید مجھکو آزمانے کی خاطر مجھ سے پوچھا کہ کیا دارالمصنفین پاکستان نہیں منتقل ہو سکتا ہے؟ سید حسام الدین راشدی صاحب بول اٹھے کہ اگر یہ پاکستان منتقل ہونا بھی چاہے تو میں اس کی مخالفت کروں گا، کیونکہ پھر دارالمصنفین دارالمصنفین نہیں رہے گا، جو کام وہاں چند ہزار روپے میں ہوتا ہے، یہاں چند لاکھ میں بھی نہ ہوسکے گا، دارالمصنفین کے رفقاء یہاں آئے تو وہ روپے کمانے اور موٹر پر سیر کرنے میں لگ جائیں گے، ان میں خدمت اور ایثار کا جذبہ مفقود ہوجائے گا، میں نے سید حسام الدین راشدی صاحب سے کہا، آپنے میرے دل کی ترجمانی کردی، اور پھر یہ بھی کہا کہ پاکستان میں مولانا شبلی کی قبر تو نہیں ملے گی جس کے مجاور بننے کے بعد ہی سب کچھ

حاصل ہوتا ہے، یہ نشست بارہ بجے ختم ہوئی تو سید حسام الدین راشدی صاحب نے فرمایا کہ مدتوں کے بعد ایسی حسین اور رنگین رات گذاری ہے۔

چلتے وقت جناب ممتاز حسن صاحب نے اپنی یاد تازہ رکھنے کے لیے Inquest of Daibul دی، جو رائٹرز گلڈ کراچی کی طرف سے بہت ہی عمدہ کاغذ اور گردپوش کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اسکے شروع میں، روم کے پروفیسر جی. ٹکی کا پیش لفظ ہے، جس میں انھوں نے اس استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ مصنف جس کی زندگی اپنے ملک کے خزانے، بینک اور اقتصادیات کو سنوارنے میں گذری، وہ اپنے ملک کی تاریخ سے اتنا واقف ہے کہ دوسرے کم واقف ہوں گے، یہی نہیں بلکہ انسانی کوششوں سے جو بھی تحقیقات بروئے کار آتی ہیں، چاہے وہ سائنس یا کسی اور سلسلہ کی ہوں، انکی توجہ ان کی طرف ضرور مائل ہوتی ہے، پروفیسر موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کبھی پاکستان کی ثقافتی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ممتاز حسن صاحب کو اثری اور تاریخی تحقیقات کے سرپرست، علمی سرگرمیوں کے روح رواں اور اردو زبان کی ترقی کے خواہاں اور پاکستان اور دوسری قوموں کے درمیان ثقافتی تعلقات کو فروغ دینے والے کی حیثیت سے نمایاں جگہ دیجائے گی، پروفیسر موصوف نے انکی انگریزی کے جاندار طرز ادا کی بھی تعریف کی ہے۔

پروفیسر صاحب نے ان کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہر اہل علم کو اتفاق ہوگا، اس کتاب کے آغاز میں ان کا مضمون "دیبل کی تلاش میں" ہے، اس سے پتہ چلے گا کہ سندھ میں عربوں کی حکومت کے زمانے کے اس مشہور شہر کی اصلی جگہ کے پتہ لگانے میں ان کا کتنا بڑا حصہ ہے، یہ شہر مٹی کے تودے کے اندر مفقود ہوگیا تھا، لیکن اب پتہ چلا ہے کہ یہ وہاں پر واقع تھا، جہاں پر سندھ میں موجود بھمبور ہے، اسکے بعد پاکستان میوزیم ایسوسی ایشن کے مختلف سالانہ اجلاسوں کے چھ خطبے ہیں، جن کو انھوں نے کلام پاک کی آیتوں اور فارسی اشعار سے مزین کرکے بہت دلچسپ بنا دیا ہے، ان کو پڑھنے کے بعد ہندوستان و پاکستان

کے انگریز، ہندو اور مسلمان ماہرین آثار قدیمہ کی ساری سرگرمیاں سامنے آجاتی ہیں، ان خطبوں میں صدارتی
کرسی کی محض رسمی باتیں نہیں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان میں اسلامی اور ہندوستانی تاریخ اور اسکے ساتھ
آثار قدیمہ کے متعلق قیمتی معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ معلوم تھا
وہ بھی اس میں ہے اور جو کچھ نہ معلوم تھا وہ بھی اس میں ہے، ان تحریروں میں ایجاز کا بڑا اچھا نمونہ ہے جو
دوسرے اہل قلم بہت سے صفحات میں کہہ سکتے ہیں، ممتاز حسن صاحب چند سطروں میں لکھکر اپنے قلم کا جادو دکھاتے ہیں،

اس کتاب میں انکے وہ صدارتی خطبے اور تقریریں بھی ہیں جو انھوں نے ڈھاکہ میں بلبل اکیڈمی، لاہور میں
اسلامک کلچر کی نمائش اور کراچی میں آدم انعامات کی تقسیم کے موقع اور رائٹرز گلڈ کے سالانہ اجلاس میں
کیں، ان میں وہی بالغ نظری، انسان دوستی، روشن ضمیری اور علوم وفنون سے دلچسپی نظر آتی ہے، جو ان کے
خمیر میں فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے، انکی فراخدلی کا بڑا ثبوت ان کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے ۱۹۶۷ء
کراچی میں بودھ پورنیما کے موقع پر کی، اس میں اسلام اور بودھ مت کی بہت سی مشترک تعلیمات کا
ذکر کرکے گوتم بودھ کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے، پھر گندھارا آرٹ کی تعریف میں انکے قلم میں بڑی شگفتگی
پیدا ہو گئی ہے، پاکستان میں ٹیکسلا، تخت بہائی، دیر اور سوات کو گندھارا آرٹ کا بہت بڑا مرکز بتایا ہے،
مشرقی پاکستان میں پہاڑپور میں بودھ کی خانقاہ کو ایشیا کی سب سے بڑی بودھ خانقاہ بتایا ہے، اس تقریر
سے یہ معلوم ہوا کہ گوتم بودھ کی جو سب سے پہلی سوانح عمری سنسکرت میں لکھی گئی ہے، وہ پاکستان ہی میں
موجود ہے، اور اس کو روم کے پروفیسر ٹکی ایڈٹ کر رہے ہیں، آخر میں ممتاز حسن صاحب نے اس تجویز کا خیر مقدم
کیا ہے کہ بودھوں کی ایک خانقاہ کراچی میں بھی ہے جبکہ یہاں ہندوؤں کے مندر، اور عیسائیوں کے
گرجے موجود ہیں، وہ پاکستان میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے بھی خواہاں
ہیں، ان کے اس خطبہ میں بڑی مذہبی رواداری پائی جاتی ہے جس کو پڑھ کر میرا یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے
کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ یہ رواداری کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر نہ ہو، اسلام امن کا پیام

ہے اور اس کا احساس وہاں کے غیر مسلموں کے دلوں میں ہونا چاہیے، اس برصغیر کے گذشتہ مسلمان فرمانرواؤں
پر الزامات عائد کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے غیر مسلموں کی عبادت گاہیں منہدم اور ان سے اور معاملات
میں برا سلوک کرکے اپنے مذہبی تعصب کا ثبوت دیا، یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس قسم کے اکثر و بیشتر الزامات بے بنیاد
اور شر انگیز ہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ یہ تاریخ کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے، جس کی تردید کرنے میں مسلمان
مورخوں کی ساری سرگرمیاں بے کار صرف ہو رہی ہیں، اب اس کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ پاکستان
کے خواص و عوام کی سیاسی نہیں بلکہ مذہبی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ
رواداری، فراخدلی اور انسان دوستی کے بہتر سے بہتر نمونے پیش کرکے نہ صرف اپنی تاریخ کو روشن
کریں بلکہ غیر مسلموں کے دلوں کو تسخیر کرکے ان میں احساس پیدا کریں کہ اسلام واقعی صلح، آشتی
امن اور محبت کا پیام ہے، ممتاز حسن صاحب نے اپنے خطبہ میں کہا ہے کہ ہم کو ایک دوسرے سے
بہت کچھ سیکھنا ہے اور اس سے زیادہ ایک دوسرے کو معاف کرتے رہنا ہے، ایک دوسرے سے
یہاں پر مراد مسلم اور غیر مسلم ہیں، کتنا اچھا جذبہ ہے، دعا ہے کہ پاکستان کے ہر مسلمان کے لیے یہ جذبہ راسخ عقیدہ
بن جائے، ممتاز حسن صاحب نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے:

"سندھ اور اس کے نواحی علاقوں میں عربوں کی حکومت دو سو برس سے زیادہ رہی، اور یہ خاص
طور پر اپنی انسانیت نوازی، رواداری اور ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے یاد کیجاتی ہے، اسلام
نے بے علمی، تعصب اور نسلی امتیازات کو دور کیا، انسانوں کے ایک دوسرے کے بیجا فوائد اٹھانے کے نظام
کو بھی ختم کیا، تعلیم کو مخصوص طبقہ کے لیے محدود کرنے کے بجائے تمام انسانوں کا مشترکہ حق قرار دیا، رسل و رسائل
کو ترقی دی، تجارت اور صنعت کو ذات پات کے مخصوص دائروں سے آزاد کرایا، شہروں کی خوشحالی میں مدد پہنچائی،
اسلام کی اس روادارانہ کشادہ دلی سے مفتوحہ علاقہ کے لوگ اسکی طرف مائل ہوئے، محمد بن قاسم کی شخصیت
میں تو اسکی رواداری کی وجہ سے افسانویت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، جب وہ واپس بلا لیا گیا اور اسکو موت کی سزا دیگئی

تو اس کی غیر مسلم رعایا یعنی سندھ کے ہندو اور بودھ مذہب کے ماننے والے اس کے لیے روتے تھے اور اس کا بت بنا کر اس کی پوجا کرنے لگے۔" (ص ۶۰)

ہم ہندستانی مسلمان یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کی اسی رواداری اور فراخ دلی کا عملی نمونہ پیش کیا جائے، اسی میں اسلام کی خدمت ہے اور سربلندی بھی، ہندوستانی مسلمان خوش ہیں کہ پاکستان میں ایک عرصۂ دراز سے ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے، اگر خدانخواستہ وہاں کبھی فساد کی نوبت آگئی تو یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کی اسپرٹ کے خلاف ہوگا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ ہوگا۔

کراچی میں دو ہفتے رہا، اس اثنا میں عزیزوں اور اعظم گڈھ کے لوگوں سے بھی ملتا رہا، اپنے اعزہ میں استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی کی بیگم صاحبہ اور عزیزی خالد شرف الدین سلمہٗ کے علاوہ میرے ماموں ڈاکٹر سید عبدالقیوم صاحب میرے کالج کے زمانے کے عزیز دوست سید محمد محسن ایم اے، ان کے صاحبزادے صبیح محسن (انجینیر پاکستان ریڈیو)، شبلی رضا (اسسٹنٹ انجینیر)، ڈاکٹر نیر رضا (پولیس اسپتال) ظفر احمد (ہیڈ ماسٹر محمد بن قاسم ہائی اسکول) اور اعظم گڈھ کے لوگوں میں افضال مبین (انجینیر سوئی گیس)، رفیع سلطان (مینیجر یونائیٹڈ بینک)، شاہ علاء الحق صاحب (سابق وکیل اعظم گڈھ)، جناب مرزا مرتضیٰ بیگ صاحب (سابق رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین)، انور نعمانی (مولانا شبلیؒ کے بھتیجے) نے ہر قسم کی خاطر و تواضع اور دعوت و مدارات کی، اور جب کراچی چھوڑ رہا تھا، تو وہاں کے علمی حلقہ کے لوگوں اور مہاجر بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی یادوں کا ایک جلوس لیکر لاہور روانہ ہوا، ہوائی جہاز پر بیٹھا تو دل یہ کہہ رہا تھا کہ کاش ہندوستان و پاکستان دونوں کے افق پر انسان دوستی کی حسین اور بہار آفریں قوس قزح دکھائی دیتی، دونوں کی سرزمین باہمی خیرسگالی کے امرت کی بارش سے سیراب ہوتی رہتی، دونوں کے درمیان اتحاد کی سندھ، یگانگت کی ستلج، موانست کی گنگا اور فراخدلی کی برہمپترا بہتی رہتی تو نہ صرف دونوں ملکوں کے باشندوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں بلکہ دونوں ملکر ایشیا کی امیدوں کے مرکز بنجاتے، اقبال نے اس برصغیر کیلئے کبھی کہا تھا،

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

اسی برصغیر کی سرزمین کے لیے انھوں نے یہ بھی کہا تھا:

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی — جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

دل کی اندرونی آواز کہہ رہی تھی، کبھی نہ کبھی دونوں ملکوں کے ساز کے شیریں نغموں سے دونوں جگہوں کے باشندوں کے دلوں میں یگانگت اور دوستی کی حرارت ضرور پیدا ہوگی۔

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

لاہور میں اپنے ایک عزیز سید عبدالاحد سلمہٗ کے یہاں قیام کیا جو وہاں کے سکریٹریٹ میں ملازم ہیں، ڈھاکہ اور کراچی میں زیادہ دن لگ گئے تھے، اعظم گڈھ پہنچنے میں بہت تاخیر ہو رہی تھی، اس لیے لاہور میں دو تین روز سے زیادہ قیام نہیں کر سکا، وہاں بھی دارالمصنفین کی مطبوعات کے سلسلہ میں اس کے بہی خواہوں سے کچھ گفتگو کرنی تھی، کراچی میں جناب محمود قاسم صاحب ڈائرکٹر نیشنل بک سنٹر (لاہور) نے طے کیا تھا کہ لاہور میں میرے پہنچنے پر وہ اپنے یہاں ایک شام ادب منعقد کرینگے اور لاہور کے اہل علم کو مدعو کر کے دارالمصنفین کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرائیں گے لیکن جس روز یہ اجتماع ہونے والا تھا، اسی روز ان کے دفتر کے ہال کا کچھ حصہ گر گیا، اسلیے یہ ملتوی کر دیا گیا، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے رفیق اور پاکستان کے مشہور مصنف جناب شاہ جعفر حسین پھلواروی ندوی کو بقول ان کے میرا بڑا انتظار تھا، ان سے انکے گھر پر ملا تو وہ دیکھتے ہی لپٹ گئے، کہنے لگے کہ میرے آنے کے سلسلہ میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ایک اجتماع ہوگا، اسکے لیے وہ وقت چاہتے تھے، انکا اصرار ہوا کہ میں لاہور کا قیام کچھ اور بڑھاؤں لیکن مجھکو واپسی کی عجلت تھی، اسلیے ان سے معذرت خواہ ہوا، پھر بھی دوسرے دن ان کی دعوت پر ادارۂ ثقافت اسلامیہ گیا، جہاں دلچسپ صحبت رہی۔

(باقی)

شوقی اور ان کی شاعری

۱۸۶۹ء - ۱۹۳۲ء

از جناب مولوی مقتدی حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی، قاہرہ

(۳)

جدید رنگ | شوقی کی شاعری میں قدیم کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا جدید رنگ بھی پایا جاتا ہے جو نتیجہ ہے شوقی کے سفر یورپ اور وہاں کے تجدیدی اور جدید ادبی رجحانات کے مطالعہ کا، یورپ کے قیام کے دوران میں فرانسیسی ادب سے واقفیت حاصل ہوئی، قریب سے یورپین تمدن و ثقافت کے مطالعہ اور وہاں کے ڈراموں وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا، انھوں نے محسوس کیا کہ عرب شعراء کی طرح یورپ کے شعراء صرف مدحیہ قصائد ہی میں الجھے نہیں رہتے، بلکہ وہ معاشرہ کے حالات اور اپنے جذبات و خیالات کی بھی ترجمانی کرتے ہیں، اس مطالعہ سے ان میں تجدیدی رجحان پیدا ہوا، اور وہ اپنی شاعری میں نئے موضوعات کو اہمیت دینے لگے، شوقیات کے مقدمہ میں انھوں نے اس تاثر کا اظہار بڑی تفصیل سے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: شاعر کو صرف مدحیہ قصائد کے اندر محدود نہیں رہنا چاہیے، یہ شاعری کے تقاضے کے خلاف ہے، بلکہ پوری کائنات اس کے سامنے رہنی اور اپنے فن سے ہر چیز کی ترجمانی کرنی چاہیے، اس کے تخیل کے دائرہ کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ اس کے اندر ہر چیز سمٹ آئے، اور اس کی شاعری کسی محدود دائرہ میں مقید نہ ہو۔

شوقی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں عربی شاعری کے ڈھانچہ میں جس ضروری تبدیلی پر زور دیا

اس کی کوئی واضح مثال وہ خود اپنے شعر میں نہیں پیش کر سکے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر اردو کی تحریک کا بہت زیادہ اثر تھا، اسی تاثیر کی وجہ سے انھوں نے فرانسیسی ادب پر زیادہ توجہ نہیں کی، رثائیہ قصائد، فراعنہ اور نیل سے متعلق اشعار میں انھوں نے ایک نیا راستہ ضرور اختیار کیا ہے، مگر ان کے علاوہ دیگر قصائد میں یہ رنگ نمایاں نہیں ہے، طٰہٰ حسین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ شوقی نے قدیم یونانی ادب اور جدید فرانسیسی ادب اور ان سے پیدا ہونے والے جدید رجحانات کو بہت زیادہ قریب سے نہیں دیکھا، اس لیے ان کی شاعری میں تجدید کا نمایاں رنگ نہیں پیدا ہو سکا۔

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ شوقی کی شاعری میں یورپین رجحانات ملتے ہیں، تاریخی اشعار میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ قدیم رجحان کے مقابلہ میں جدید رجحان غالب نہ آسکا، اور شوقی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قدیم عربی شاعری ہی کو فروغ دینے میں صرف کیا۔

مؤثرات | شوقی کی شاعری جن چیزوں سے متاثر ہوئی اور جن کی وجہ سے انکی شاعری میں نیا موڑ پیدا ہوتا رہا ان میں سب سے پہلے اس دور کے ناقدین کا نام آتا ہے، انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے اوائل تک عربی تنقید بالکل خشک، بے روح اور غیر دلچسپ تھی، تنقید نگار لغت، نحو و صرف عروض اور بلاغت کے معیار سے آگے نہیں سوچ سکتے تھے، شوقی نے شاعری کے میدان میں تمام قواعد سے مسلح ہو کر قدم رکھا، تاکہ ناقدین کی گرفت سے بچ سکیں، شیخ حسین المرصفی کی کتاب "الوسیلۃ الادبیہ" اس سلسلہ میں ان کا قابلِ وثوق ماخذ تھی۔

۱۸۹۸ء میں جب شوقی نے اپنے دیوان "الشوقیات" کا پہلا حصہ شائع کیا تو اس کے مقدمہ میں شعر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا، اور فرانسیسی ادب کی روشنی میں عربی شاعری میں تجدید کی کوشش کی، تنقید نگاروں نے شوقی کی اس کوشش کو عربی شاعری کی روایات کے خلاف بغاوت تصور کر کے ان کی مخالفت کی، کیونکہ وہ یہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ قدیم روایات سے ہٹ کر بھی عربی

شاعری کو باقی رکھا جا سکتا ہے، اس لیے شوقی اور ناقدین میں ٹکراؤ پیدا ہوا جس کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

محمد المویلحی نے رسالہ "مصباح الشرق" کے متعدد مضامین میں شوقی کے اس تجدیدی رجحان پر کڑی نکتہ چینی کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربی شاعری کو اس طرح کی تجدد پسندی کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اور شوقی کی بعض لغوی لغزشوں کا سہارا لیکر انکی شاعری کو بے وزن کرنا چاہا۔[1]

اسی طرح الیازجی نے اپنے افسانہ "عذراء الہند" میں شوقی پر زبردست نکتہ چینی کی۔[2]

ان تنقیدوں سے شوقی متاثر ہوئے، انھیں اس کی توقع نہیں تھی کہ ان کے فن کے ساتھ ایسا سخت برتاؤ کیا جائے گا، اس لیے شروع میں وہ ڈر گئے، اگر وہ ان کی نکتہ چینیوں پر توجہ نہ دیتے تو اس کا ان کے فن پر اچھا اثر پڑتا، کیونکہ یہ تنقیدیں لغوی اعتبار سے بھی کسی مخصوص قاعدہ یا طرز فکر پر مبنی نہیں تھیں ناقدوں نے اپنے ذاتی خیال اور محدود نقطۂ نظر کی بنا پر شوقی کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنایا تھا، ہر نئی چیز سے انھیں نفرت تھی، اور صرف اس لیے کہ یہ چیزیں ان کے ذوق اور موروثی افتاد ذہن کے خلاف تھیں اپنے مالوف نہج سے ہٹ کر وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں تھے،

مغربی ادب وثقافت اور تہذیب وتمدن کے رواج کے بعد شعراء میں نمایاں تبدیلی ہو چکی تھی، ان کے احساس میں نزاکت اور مزاج میں رقت پیدا ہو گئی تھی، اور ان کا ذوق شاعری بہت کچھ سنور چکا تھا، شوقی اور ان کے جیسے دوسرے شعراء نے یہ محسوس کیا کہ محدود روایتی عربی شاعری میں امرؤ القیس اور زہیر سے لیکر آج تک ایک ہی طرز کے افکار وخیالات اور اسلوب کو دہرایا جا رہا ہے۔ اس لیے جدید دور کے لوگوں کے لیے اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی ہے، شعراء میں تو اس رجحان سے تبدیلی پیدا ہو گئی، لیکن تنقید اس نئے رجحان کے ساتھ نہیں

---

[1] مختارات المنفلوطی ص ۲۰۷ وما بعدہا [2] شکیب ارسلان: شوقی ص ۵۴

چل سکی، ناقدوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو ادب کا باغی قرار دیا اور لغت وقواعد کا سہارا لیکر قدیم ڈھانچہ کی حمایت وحفاظت کے لیے آمادہ ہو گئے، ان لوگوں کا شاید خیال یہ تھا کہ یورپ کی مادی تہذیب سے مشرق میں جو زندگی کا نیا ڈھانچہ بن گیا ہے، شاعری کے قدیم اسلوب پر اس کا اثر نہ پڑنا چاہیے، اس ادبی جمود سے بہت سے ادباء فصیح عربی زبان میں لکھنے ہی کے مخالف ہو گئے، اور عامی زبان کو اپنا ترجمان بنا لیا، لیکن شوقی نے زبان کے خلاف اس بغاوت میں حصہ نہیں لیا، اور شاعری کی قدیم روایات اور ڈھانچہ کو باقی رکھا مگر ان کے تنقید نگار اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئے، ان کی خواہش تھی کہ شوقی منظوم ڈراموں اور فرانسیسی شاعری کے نمونوں کی تقلید اور موروثی عربی شاعری سے کسی طرح تجاوز نہ کریں،

ناقدین کی اس روش کا شوقی پر گہرا اثر پڑا، چنانچہ تجدید کا جو رجحان ان کے دیوان شوقیات کے مقدمہ میں نمایاں نظر آتا ہے وہ بعد میں مدھم ہونے لگا، اور شوقی قدیم عربی شاعری کے دائرہ میں محدود ہو گئے، متقدمین شعراء کا تتبع کیا، اور اسی کو اپنے فن کی آماجگاہ بنا لیا، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں تقلید وتتبع کے اس میدان میں بھی ان کا فنی کمال نمایاں ہو گیا، اور بہت سے قصیدوں میں وہ اپنے پیشرو شعراء سے آگے بڑھ گئے۔[1]

یہ تنقید تلخ تو ضرور تھی، لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ شوقی شاعری میں بہت زیادہ محتاط ہو گئے، اور قدیم طرز سخن میں اتنی مہارت حاصل کی کہ بعض قصیدوں میں قدیم روایات اور فنی محاکات کی تصویر پیش کر دی، دوسری طرف اس تنقید کا مضر اثر یہ پڑا کہ شوقی کے تجدیدی حوصلوں پر بندش لگ گئی اور دیوان کے مقدمہ میں انھوں نے شاعری میں جن نئے ابواب کے اضافہ کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ معرض وجود میں نہ آسکے، منظوم ڈراموں کا سلسلہ بھی

---

[1] شوقی ضیف: شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۹۷

ناتمام رہ گیا، اور شوقی اپنے ممدوح خدیوی کی تعریف کے لیے وقف ہوکر رہ گئے۔

اس کے بعد ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا، مغربی ادب سے شعراء اور ادیبوں کا ربط زیادہ بڑھا، فرانسیسی ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا ان کے ادبی نمونوں کو دیکھنے کے ساتھ یورپین مصنفین کی تنقید کو بھی پڑھنے کا انھیں موقع ملا اس سے انھیں اندازہ ہوا کہ جدید عربی ادب مغربی ادب کے مقابلہ میں انتہائی محدود اور زندگی کے میدان میں بالکل قاصر ہے۔

اس سے ادبا کی ایک جماعت میں تنقید و شاعری کا ... نیا رجحان پیدا ہوا، جو قدیم رجحان سے یکسر مختلف تھا، اس جماعت میں ازہر کا کوئی ادیب نہیں، سب جدید تعلیم یافتہ تھے، جو ہر طرح کے تعصب اور جمود سے خالی الذہن تھے، یہ بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، اس نئی تحریک کے علمبردار عبدالرحمٰن شکری، ابراہیم عبدالقادر المازنی اور عباس محمود العقاد تھے، اول الذکر دونوں مدرسۃ المعلمین العلیا کے تعلیم یافتہ تھے، عقاد نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، بلکہ اپنی خداداد صلاحیت اور وسیع مطالعہ کی بدولت اپنے دونوں ساتھیوں ہی کی طرح مغربی ادب سے پوری طرح واقف اور اس کی وسعتوں سے آگاہ تھے۔

عبدالرحمٰن شکری کی توجہ تمام تر تنقید کے بجائے شاعری پر رہی، انھوں نے جدید عربی شاعری میں ایسے ادب کا اضافہ کیا جس میں کسی کی مدح و توصیف کے بجائے انسانی زندگی اور اس کے خیر و شر اور آلام و مصائب کی ترجمانی تھی، انھوں نے ۱۹۰۹ء میں جدید شاعری پر مشتمل دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا، شکری صرف شاعر تھے، اور عقاد اور مازنی نقاد بھی تھے اور شاعر بھی، انھوں نے جدید شاعری کا نمونہ بھی پیش کیا، اور جدید تنقیدی رجحان کو بھی آگے بڑھایا، مشہور انگریز ادبا اور تنقید نگاروں کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا،[1]

---

[1] المازنی: الشعر غایاتہ و وسائطہ طبع ۱۹۱۵ء

ان کی کوشش سے عربی تنقید میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا، اور قدیم اسکول کے حامیوں کے دوش بدوش نیا طبقہ بھی میدان میں اتر آیا جو بہت جلد پرانے طرز کے ناقدین پر چھا گیا مازنی، عقاد اور شکری کے ہاتھوں جدید تنقید کی جو تحریک پروان چڑھ رہی تھی، اس نے بیسویں صدی کے شروع ہی میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا ۱۹۱۳ء میں عقاد نے شکری کے دیوان کے دوسرے حصہ کا مقدمہ لکھا، اس میں شکری کی تجدیدی کوششوں کو سراہتے ہوئے جدید شاعری کے موضوع پر بھی روشنی ڈالی، اور بتایا کہ شاعری میں قوم کی مادی و سماجی زندگی اور خود شاعر کی نفسیات کی ترجمانی ضروری ہے، جدید شاعری کی جن لوگوں نے اس بنا پر مخالفت کی تھی کہ اس کا اسلوب انگریزی ہے، عربی اسلوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے عقاد نے دیوان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ شعر کو نفس انسانی کا ترجمان ہونا چاہیے، اس میں مشرقی و مغربی اور انگریزی اور غیر انگریزی کی کوئی قید نہیں ہے، اس مقدمہ میں شکری اور ان کے جدید طرز شاعری کا مکمل دفاع کیا، اس کے بعد جب مازنی نے اپنا دیوان شائع کیا تو اس کے پیش لفظ میں عقاد نے اس دور کی شاعری، تنقید اور تجدیدی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ: بیس سال قبل کے حالات سے آج کے حالات بالکل مختلف ہیں، ادب کی بساط پر ایسے لوگ آچکے ہیں جنھیں جمود سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا، نئے ادب کے مطالعہ کی بدولت وہ بہت آگے جاچکے ہیں، ان کا احساس و شعور مشرقی ضرور ہے، لیکن دنیا کو وہ اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے ایک مغربی دیکھتا ہے۔ لکھنے والوں کے قلم اب آزاد ہوچکے ہیں اور انھوں نے مصنوعی قیود کا پردہ چاک کردیا ہے، شعرا میں آزادی کی ایسی روح پیدا ہوچکی ہے جس نے آج کے ادب کو بہت اونچا مقام عطا کیا ہے، آج کا شاعر اگر غمگین ہے تو کسی کو تہنیت نامہ نہیں لکھ سکتا، خلوت میں جس کی مذمت اور ہجو کرتا ہے جلوت میں اس کی تعریف نہیں کرسکتا، اپنے فن کو وہ عطایا و تحائف کے عوض نہیں بیچتا جس طرح

ایک تاجر اپنا سامان بازار میں فروخت کرتا ہے،

عقاد نے اس مقدمہ میں جدید اسکول کے اصول و نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نئی نسل کا شاعر خود اعتمادی سے الامال اور ریاکاری و خوشامد سے کوسوں دور ہوتا ہے، مدح و تعریف کے رجحانات اور تکلف و تصنع کی بیڑیوں سے وہ آزاد ہو چکا ہے۔ اس کے کلام میں نہ تو مدح و تہنیت کے اشعار ہیں، اور تقریبات میں سنانے والے قصائد۔ اسکی شاعری تجربات کا نچوڑ، ذاتی رجحان و شعور کی ترجمانی، لوگوں کی زندگی کی تصویر اور ان کے افکار و خیالات کا مرقع ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جدید عربی تحریک کے تینوں رہنماؤں میں جو قدیم روایات کے حامیوں سے برسرپیکار رہتے تھے خود اختلاف پیدا ہوگیا اور مازنی و شکری میں قلمی معرکہ آرائی شروع ہوگئی، چنانچہ شکری نے اپنے دیوان کے پانچویں حصہ کے مقدمہ میں مازنی پر مغربی شعرا سے سرقہ کا الزام لگایا اور ان پر بڑی تنقید کی۔ اس دوران میں جنگ عظیم ختم ہوگئی اور شوقی وطن واپس آگئے، عقاد و مازنی کے نزدیک شوقی کی شاعری بالکل ناقابل اعتنا تھی اور جدید ادبی اسکول سے اس کا کوئی میل نہیں تھا اور اس پر انھوں نے بڑی تنقیدیں کیں، شوقی کے حامی اور ادیبوں نے بھی اس کا پورا جواب دیا جس کی تفصیل بڑی طویل ہے۔

فروری ۱۹۲۳ء میں جب مصر میں پارلیمانی نظام قائم ہوا اور مصری عوام کو رائے کی آزادی ملی تو مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود عمل میں آیا، الہلال اور المقتطف وغیرہ ادبی و سیاسی رسالوں کے ذریعہ سیاسی و تنقیدی ادب کے میدان میں بھی سرگرمی پیدا ہوئی، اسی دور میں طہٰ حسین نے جاہلی دور کے ادب پر شکوک نگاہ ڈالی اور یہ دعوی کیا کہ اسکی تاریخ قطعی نہیں کہی جاسکتی، انھوں نے اس موضوع پر جب اپنی کتاب شائع کی تو ادبی دنیا میں

زبردست ہیجان پیدا ہوگیا، اور ان کے مقابلہ اور تردید کے لیے ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا مقصد عربی زبان کے قدیم ادبی سرمایہ و نظریات کا تحفظ تھا،

یہ اختلاف طرفین اور ان کے مخالفین کا اختلاف نہیں رہ گیا تھا، بلکہ اس کی حیثیت ایسے اختلافی مسئلہ کی ہوگئی جس نے دو مختلف مکتب فکر یعنی مجددین (تجدید پسند) اور محافظین (قدامت پرست) پیدا کر دیے، قدیم مکتب فکر کی رہنمائی مصطفےٰ صادق الرافعی کر رہے تھے، جو صرف طہٰ حسین ہی کے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے شدید مخالف تھے جو عربی ادب سے بغاوت یا اس میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ الہلال میں ان کے اور سلامہ موسی کے درمیان "قدیم و جدید" کے موضوع پر طویل بحث و مناظرہ کا سلسلہ شروع ہوگیا، سلامہ موسی عربی ادب کے پورے سرمایہ کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مادی زندگی بدل چکی ہے، اس لیے شعور و جذبات میں تبدیلی اور ادب اور تعبیر کا طرز بدلنا بھی ضروری ہے۔ اس کے مقابلہ میں رافعی کا خیال تھا کہ عربی ادب میں ہر جدید رجحان کو سمونے کی گنجائش موجود ہے، اس لیے اس کے ڈھانچہ کو بدلنا غلط ہے، عربوں کے اسلوب اور طرز کے خلاف جو ادب بھی ہوگا وہ عربی ادب نہیں کہلا سکتا۔ اس معرکہ آرائی میں آگے چل کر عقاد بھی شریک ہوگئے، اور ان کے اور رافعی کے درمیان مضامین کا سلسلہ شروع ہوگیا، رافعی نے اپنی کتاب "علی السفود" میں عقاد اور ان کے نظریات و اشعار پر زبردست تنقید کی ہے،[1]

عربی تنقید کی اس گرم بازاری کے دوران میں نئی نسل کے ناقدوں نے بھی مختلف رسالوں میں لکھنا شروع کیا، اور ادب کی تحلیل و تجزیے سے متعلق متعدد مسائل اٹھ کھڑے ہوئے،

---

[1] شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۱۰۷

شاعری میں "قدیم وجدید" کے موضوع پر لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، شوقی کی شاعری اب صرف مدحیہ قصائد تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ قومی زندگی اور تعمیری کاموں سے متعلق نئے موضوعات وحالات پر بھی اظہار خیال کرنے لگے تھے، اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ شوقی کے آخری صنف کے اشعار بھی ان کے مدحیہ قصائد کی طرح ناقابل اعتنا ہیں، یا جدید شاعری میں ان کا کوئی قابل ذکر مقام ہے۔ اس موضوع پر طہٰ حسین، مازنی اور عقاد سبھی نے روشنی ڈالی، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ شوقی کی تجدیدی کوشش نامکمل ہے، کیونکہ شاعر نے اپنے آپ کو واقعات سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ اگر وہ واقعات رونما نہ ہوں تو اس کا قلم خاموش رہے گا، حالانکہ شاعر کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی شاعری کا ایک واضح مقصد رکھے، اور اسی پر اس کی توجہ مرکوز رہے۔ واقعات کے جھونکوں کے ساتھ گھومنے میں کوئی کمال نہیں ہے۔ ان ناقدوں میں خصوصیت کے ساتھ عقاد نے شوقی پر زبردست تنقید کی اور لکھا: لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید اور عصری شاعری کا مطلب ایجادات واختراعات کا تذکرہ ہے۔ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ لازم ہوگا کہ شعراء کارخانوں وفیکٹریوں سے مربوط رہیں، اور جب بھی کوئی نئی چیز ایجاد ہو، تو اس کو اپنے اشعار میں جگہ دیں، یورپ اور امریکہ کے شعراء نے تو ایسے موضوعات پر بہت کم لکھا ہے، پھر بھی ہم انھیں قدیم یا تقلیدی شاعر نہیں کہہ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ قدیم معیار سے شاعری کو جانچنا چاہتے ہیں اور ان پر جاہلی دور کی شاعری چھائی ہوئی ہے، اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ تجدید پسند ہیں، جاہلی شعراء نے اگر اونٹنی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا تو ان لوگوں کو ہوائی جہاز پر اشعار کہنا چاہیے، گویا شاعری کا مقصد ذرائع حمل ونقل ہی تک محدود رہنا چاہیے، جدید علوم سے تعلق رکھنے والے بعض افراد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر جب تک اپنے زمانہ کے تمام سماجی حالات پر قصائد نہ لکھے اس وقت تک اسے اپنے دور کا ترجمان نہیں مانا جا سکتا، مگر یہ ستم ظریفی ہے

گوئٹے کا پورا دیوان دیکھ جائیے، جرمنی کی سیاسی کشمکش سے متعلق ایک شعر بھی نہیں ملے گا، پھر بھی تمام ناقدین اسے متفقہ طور پر جرمنی کا سب سے بڑا قومی شاعر تسلیم کرتے ہیں[1]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۰ء کی درمیانی مدت میں شوقی پر مختلف لوگوں نے مختلف حیثیتوں سے تنقید کی، جن میں عقاد اور طہٰ حسین کی تنقید زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ شوقی نے مختلف مناسبتوں پر جو اشعار لکھے تھے، ان سے طہٰ حسین بالکل مطمئن نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ شوقی اور ان کے ہم مشرب حافظ معلومات ومطالعہ کے میدان میں سستی کا شکار ہیں، اسی اثنا میں احمد لطفی السید نے جب ارسطو کی کتاب "الاخلاق" کا ترجمہ کیا تو شوقی نے ایک عمدہ قصیدہ لکھا، اور افلاطون کے بعض نظریات کو اس کے شاگرد ارسطو کی جانب منسوب کر دیا، طہٰ حسین کو موقع مل گیا، انھوں نے شوقی پر بڑی لے دے کی، اور فلسفیانہ معلومات میں ان پر کوتاہی کا الزام لگایا[2]

لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ شاعر نظریہ کی ترجمانی نہیں کرتا، اس کی بنیادی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ شعور اور احساس کو الفاظ کا جامہ پہنا دے، اس لیے جن لوگوں نے شوقی سے فلسفہ کی تعبیر یا مغربی شاعری کی تقلید کا مطالبہ کیا تھا، وہ حق بجانب نہیں تھے، ان کی رائے میں غلو ہے، مثلاً شکسپیر کے بارے میں شوقی کے قصیدہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے طہٰ حسین لکھتے ہیں: شوقی کے اس قصیدہ کو پڑھنے والے جان سکتے ہیں کہ انگریز شاعر کے بارے میں شوقی کا مطالعہ محدود تھا اور محض شکسپیر کی ستائش ہے، اور شکسپیر کے اشعار کو انجیل کی آیتوں سے اور ان کے مفہوم کو حضرت عیسیٰؑ کے مفہوم سے تشبیہ دی گئی ہے، معلوم نہیں حضرت عیسیٰؑ اور شکسپیر میں کونسی چیز مشترک ہے، اور ایک شاعر کے ادب کو انجیل سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے، شاید ہمارے شاعر نے یہ سوچا کہ

---

[1] العقاد: ساعات بین الکتب ص ۱۱۹ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء [2] طہٰ حسین: حافظ وشوقی ص ۱۱۵

اس سے پڑھنے والوں پر ایک تاثر قائم ہوگا، اور وہ الفاظ کے شکوہ وجلال میں کھو کر مفہوم سے غافل ہو جائیں گے۔ حالانکہ اسی شاعر کے بارے میں فرانسیسی اور جرمن شعراء کی رائے پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شوقی کے افکار ان کے مقابلہ میں بالکل بے وزن ہیں، حالانکہ موضوع دونوں کا ایک ہے۔[1]

طٰہٰ حسین اور عقاد نے شوقی پر جو تنقید کی ہے اس کا بیشتر حصہ اسی طرح کے تحکم اور بیجا اعتراض پر مبنی ہے، یہ دونوں شوقی کی شاعری کو مغربی تنقید کے معیار سے جانچتے تھے، شوقی پر ان کا اعتراض یہ تھا کہ وہ قدیم شاعری کے ڈھانچوں اور تصویروں کو اپنے اشعار میں بعینہٖ نقل کر دیتے ہیں جس سے ایک طرح کا تکلف ظاہر ہوتا ہے، ترکی میں "ام المحسنین" کی واپسی پر شوقی نے ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:-

(۱) أرفعي الستر وحيي بالجبين — وارينا فلق الصبح المبين

(۲) وقفي الهودج فينا ساعة — نقتبس من نور ام المحسنين

(۳) واتركي فضل زماميه لنا — نتناوب نحن والروح الامين

(۱) پردہ اٹھا کر چہرے سے سلام کرو اور ہمیں نور صبح دیکھنے دو۔

(۲) تھوڑی دیر ہودج کو روکے رکھو تاکہ ہم ام المحسنین سے روشنی حاصل کر لیں۔

(۳) اور ہمارے لیے لگام کا باقیماندہ حصہ چھوڑ دو اسے ہم اور روح الامین پکڑے ہوئے چلیں گے۔

ظاہر ہے ام المحسنین کی واپسی ہودج میں نہیں بلکہ موٹر میں ہوئی تھی، نہ وہاں زمام تھی نہ ہودج، اور اس لیے ناقدین نے اعتراض کیا کہ شوقی کو اپنی شاعری میں واقعیت پسندی سے کام لینا چاہیے، اور ہودج کے بجائے موٹر کہنا چاہیے تھا، مگر وہ حال سے کھنچ کر ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں، اور جاہلی دور کی اونٹنی اور اونٹ کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاہرہ کی متمدن اور شہری زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، مواصلات کے وسائل اب چونکہ بالکل

[1] طٰہٰ حسین: حافظ وشوقی ص ۲۰۳

بدل چکے ہیں، اس لیے آج کی شاعری میں قدیم وسائل کا تذکرہ حال سے گریز اور ماضی سے بیجا تعلق کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے شاعری "واقعیت" کے بجائے "فرضی" ہو جاتی ہے لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس طرح کے استعمالات میں کوئی حرج نہیں، شاعر جب ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کا مقصد بعینہٖ یہی چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ ان سے رمز کے طور پر وہ آج کی مروجہ اشیاء مراد لیتا ہے، ہودج کا تذکرہ اسی لیے کیا گیا ہے کہ قدیم شاعری کی ایک جانی پہچانی چیز کے ذکر سے کلام میں وقار اور جلال پیدا کیا جائے، ناقدین کو اعتراض سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ شاعر کو خود معلوم ہے کہ یہ قدیم زمانے کی سواری ہے جس کو اب کوئی استعمال نہیں کرتا، اس کے باوجود اس نے اس کا نام کیوں لیا؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس سے شاعری میں ایک طرح کا جمال پیدا ہو، اور ماضی کا وقار اس سے وابستہ ہو جائے، وہ ان چیزوں سے کبھی حقیقی معنی مراد نہیں لیتا بلکہ رمز کے طور پر وہی وسائل اور صورتیں مراد ہوتی ہیں، جو آج قدیم وسائل کی جگہ لے چکی ہیں۔

دنیا کا ہر فرد جانتا ہے کہ انسان اپنے ماضی سے اپنا رشتہ یکسر ختم نہیں کر سکتا، اس سے اس کا لگاؤ برابر باقی رہتا ہے، اور اس میں جو کشش اس کے لیے موجود ہے اس میں کمی نہیں آتی، ایسی صورت میں اگر ہم شوقی کو اس جذبہ کے اظہار سے محروم رکھیں تو یہ یقیناً ناانصافی ہوگی، البتہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ شوقی قدیم ڈھانچے اور تصاویر کی تقلید میں کہاں تک کامیاب رہے، اور اس تتبع میں اپنے جذبات وخیالات کی ترجمانی کس طرح کی ہے، محض قدیم عناصر کے استعمال پر نکیر کرنا بڑی زیادتی ہے، جبکہ وہ مفہوم کی ادائیگی اور جذبات کی تصویر کشی میں پوری طرح کامیاب ہیں اور اس سے ان کے کلام میں کوئی شاعرانہ نقص نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اس میں وہ بسا اوقات اپنے پیش رووں سے آگے نکل گئے ہیں، پھر وہ صرف قدیم عناصر

کے دائرہ میں محدود نہیں ہے، بلکہ قدیم وجدید کے امتزاج کا عمدہ نمونہ بھی پیش کیا ہے، جس سے عربی شاعری کی روح بھی باقی رہتی ہے، اور موجودہ دنیا سے بھی تعلق منقطع نہیں ہوتا،

شوقی پر تنقید کرنے والوں میں طٰہٰ حسین، عقاد سے زیادہ معتدل اور حقیقت شناس ہیں، انھوں نے شوقی پر تنقید میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے، اور ہمیشہ ان کی فنی صلاحیتوں اور ذہنی تفوق کو سراہا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ شوقی عربی شاعری میں اس کی قدیم تر و تازگی واپس لائے اور مصر کی جدید ترقی کے لیے راستہ ہموار کیا، جس سے آج مصر کو اسلامی ممالک میں عرب شعراء کی قیادت و رہنمائی کا مقام حاصل ہوا[1]، لیکن عقاد نے شوقی کے ہر قصیدہ کو بے وزن ثابت کرنے میں پورا زور صرف کر دیا،

ناقدین نے شوقی اور ان کی شاعری پر جو تنقیدیں کیں ان سے شوقی اور انکے فن کو بڑا فائدہ ہوا، اور اس کے بہترین نتائج برآمد ہوئے، اسی سے عوام سے ان کا ربط پیدا ہوا، اور انھوں نے ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی، لیکن اس تبدیلی سے ان کے ناقدین کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور وہ شوقی کے ہر قسم کے اشعار پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے، ان کا خیال تھا کہ شوقی اپنی شاعری اور منظوم ڈراموں میں بھی یورپ کے شعراء کی بلندی کو چھونے سے قاصر رہے۔

عوام اور صحافت

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر کے شعراء، جمہور سے عام طور پر متاثر نظر آتے ہیں، اس سے پہلے کی ادبی تاریخ میں یہ چیز کم ملتی ہے، ابوتمام اور متنبی جیسے ممتاز شعراء کا پورا کلام امراء، سلاطین اور ان کے مصاحبین کے تذکرے سے پُر ہے، ان کی شاعری کا محور عوام کے بجائے صرف دولتمند طبقہ ہے، اسی لیے قرونِ وسطیٰ

[1] شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۱۱۵

کی عربی شاعری مسلم عوام کی ترجمانی و تصویر کشی سے قاصر ہے، اس میں انکے رجحانات واحساسات کو کوئی مقام نہیں دیا گیا ہے، خود شوقی کے استاد بارودی کی شاعری اس سے خالی ہے، لیکن بعد کے دور میں تعلیم کی اشاعت اور طباعت کے وسائل کی فراوانی سے بیشتر شعراء کو عوامی مسائل اور ان کے جذبات واحساسات کا لحاظ رکھنا پڑا، اس سے ان کی شاعری میں جدت وتازگی پیدا ہوئی، اور انھوں نے اخبارات ورسائل میں اپنا کلام نشر کرنا شروع کیا، شوقی اور حافظ وغیرہ کا اس میں بڑا حصہ ہے، اس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں،

مغربی حکومتوں نے جب ترکی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو اس سے عام مسلمانوں میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا، شوقی نے بھی اپنی شاعری میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی، چنانچہ شوقیات میں ایسے قصیدوں کی کثرت ہے جن میں ترک قوم اور خلیفہ کی شجاعت وبہادری اور ان سے وابستہ امیدوں کا تذکرہ ہے، شوقی کی رگوں میں ترکی نسل کا بھی خون تھا، اس لیے انکی اس شاعری میں اور زیادہ گرمی اور جوش پیدا ہو گیا، اور ترکوں سے متعلق ان کے اشعار میں غیر معمولی جلال وجمال نظر آتا ہے۔

ایسے اشعار میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی تھی، اس لیے ان میں مذہبی عنصر زیادہ ہے، اور خلیفہ کی جو مدح ہے، اس کی حیثیت سلاطین کی شان میں مدحیہ قصائد سے مختلف ہے، یہ مدحیہ قصیدے خلیفہ کو سنانے یا انعام حاصل کرنے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے، بلکہ ان کے مخاطب مسلم عوام تھے، اس لیے ان میں ان کے جذبات کا احترام اور ان کے دینی شعور کی ترجمانی ضروری تھی، اس میں شوقی پوری طرح کامیاب ہوئے، ترکی خلیفہ کی مدح کے قصیدوں میں اسلامی جذبات کی بہترین عکاسی ہے، "صدی الحرب" (جنگ کی صدائے بازگشت)

کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا، اس کا مطلع ہے

بسیفک یعلو الحق والحق اغلب — وینصر دین اللہ ایان تضرب

(تمھاری شمشیر سے حق بلند ہوتا ہے اور حق ہمیشہ غالب ہوتا ہے، تمھاری ہر ضرب میں دین کی نصرت اور مدد ہوتی ہے)

ظاہر ہے کہ ان دینی جذبات کے مخاطب خلیفہ نہیں، بلکہ مصری اور عرب عوام تھے، یہ عربی شاعری کی تاریخ کا اہم موڑ تھا، اور اس کے بعد شعراء نے عوام اور جمہور کو اپنے کلام میں ہمیشہ پیش نظر رکھا، اور ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔

پورا قصیدہ اسی طرح کے دینی جذبات اور ترکوں کی شجاعت وبہادری کے تذکرے سے معمور ہے، آخر میں خلیفہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فلا زلت کہف الدین والہادی الذی — الی اللہ بالزلفی لہ نتقرب

تو ہمیشہ دین کی پناہ اور رہنما کی حیثیت سے باقی رہے، اور تیرے تقرب سے ہم خدا کا قرب حاصل کرتے رہیں

پھر یہ دینی جذبہ آگے بڑھکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح تک پہنچ گیا، شوقی سے پہلے بھی شعراء نے نعتیہ قصائد لکھے تھے، ان میں البوصیری کے قصیدۂ ہمزیہ اور قصیدہ بردہ کو زیادہ شہرت حاصل ہے، شوقی نے البوصیری کے تتبع میں دو قصیدے لکھے، ہمزیہ اور میمیہ، ہمزیہ قصیدہ کا مطلع ہے،

ولد الہدی فالکائنات ضیاء — وفم الزمان تبسم وثناء

ہادی عالم کی ولادت سے کائنات منور ہے، اور زمانہ سراپا تبسم وتعریف

اس قصیدہ میں شوقی نے البوصیری کے خیالات ومعانی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور اسلامی توحید اور اسلام کے سیاسی وسماجی نظام کی طرف بھی

اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں:

انصفت اہل الفقر من اہل الغنی — فالکل فی حق الحیاۃ سواء

فلو ان انسانا تخیر ملۃ — ما اختار الا دینک الفقراء

(آپ نے فقیر اور مالدار کے درمیان انصاف کرکے حق زیست میں سب کو مساوی قرار دیا اگر لوگوں کو مذہب کے انتخاب کی آزادی دیدی جائے تو فقراء آپ ہی کا مذہب اختیار کریں گے)

قصیدہ بردہ کی مقبولیت بے مثال ہے، اسے پڑھکر آج بھی لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے، احمد زکی لکھتے ہیں

البوصیری کا تتبع ہر زمانہ میں بے شمار لوگوں نے کیا لیکن ان کے قصیدہ بردہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ آج تک باقی ہے، شوقی کے قصیدہ سے بھی بردہ کی اہمیت کم نہیں ہو سکی، مگر خود اس قصیدہ کو بھی بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، مصر میں حدیث کے استاذ الاساتذہ اور جامعہ ازہر کے شیخ سلیم البشری نے اس کی شرح لکھی، شوقی نے یہ قصیدہ اپنے دور شباب میں لکھا تھا، شیخ ازہر کے قلم سے اس کی شرح شوقی کی کامیابی اور مقبولیت کی واضح دلیل ہے[1]

شوقی کی شاعری میں جلاوطنی کے بعد ہی سے تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، اور وہ قصر کی محدود زندگی سے نکل کر ایک وسیع فضا میں آ گئے تھے، اور ان میں قومی شعور بیدار ہو چکا تھا، جب وہ وطن واپس آئے اور یہاں قومی انقلابی تحریک اور عوام کے خون سے رنگین وطن کی سرزمین نے ان میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا، وطن کی واپسی میں طلبہ نے ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا پلیٹ فارم سے کندھوں پر اٹھا کر باہر لائے، احترام ومحبت کا یہ جذبہ دیکھکر شوقی فرط مسرت سے رو پڑے، ان کا ضمیر بیدار ہو گیا، اور انھوں نے "بعد المنفی" کے عنوان سے ایک قصیدہ لکھا جس میں

---

[1] ذکری الشاعرین ص ۳۳۱

وطن کی واپسی اور اپنی خوشی اور وطن سے اپنے گہرے لگاؤ کا اظہار کیا ہے، کہتے ہیں :-

یا وطنی لقیتک بعد یاس　　　کانی قد لقیت بک الشبابا

وکل مسافر سیؤب یوما　　　اذا رزق السلامۃ والایابا

ولوانی دعیت لکنت دینی　　　علیہ اقابل الحتم المجابا

ادیر الیک قبل البیت وجھی　　　اذا فہت الشہادۃ والمتایا

میرے وطن ! مایوسی کے بعد تم سے ملکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوانی کے ایام لوٹ آئے ہیں،

ہر مسافر ضرور لوٹ کر آتا ہے بشرطیکہ سلامتی اور رجوع اس کے لیے مقدر ہو،

میری موت بھی آتی تو تم کو اپنا مذہب سمجھکر تمھیں پر جان دیتا،

اور کلمۂ شہادت ادا کرتے ہوئے قبلہ سے پہلے تمھاری طرف رخ کرتا۔

مصر میں جب بھی کوئی قومی و سیاسی واقعہ پیش آتا تو شوقی اس پر قصیدہ لکھتے تھے، اور اہل وطن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے تھے، ایک فوجی افسر کے قتل کے الزام میں انگریزی فوجی عدالت نے کچھ لوگوں کو قید کر دیا تھا، ۱۹۲۴ء میں ان رہائی کے موقع پر شوقی نے قصیدہ لکھا :-

وجد السجین ید احطم قیدہ　　　من ذا یحطم للبلاد قیودا

یا فتیۃ النیل السعید حذووا　　　واستانفوا نفس الجہاد مدیدا

ان الذی قسم البلاد حباکم　　　بلدا کاوطان النجوم مجیدا

قد کان والدنیا لحود کلہا　　　للعبقریۃ والفنون مہودا

قیدی کو رہا کرنے والے تو مل گئے لیکن ملک کی بیڑیوں کو کون توڑے گا؟

وادی نیل کے جوانو ! مسلح ہو کر پھر اپنی جد و جہد کا آغاز کرو

خدا نے تمھیں ایسا ملک عطا کیا ہے جو آسمان کے مانند برتر و بہتر ہے،

جب پوری دنیا میں صلاحیتوں کا گلا گھونٹا جا رہا تھا اس وقت بھی یہ ملک علوم و فنون کا گہوارہ تھا)

اس سے ان کی قومی شاعری کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ تعلیم یافتہ طبقہ انکے قصیدوں کا بےچینی سے منتظر رہتا، اور ان کو پڑھ کر تشفی حاصل کرتا تھا، قومی شاعری کے میدان میں حافظ ابراہیم بھی شوقی کے ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ان کے اشعار میں وہ قوت و حسن نہ پیدا ہو سکا جو شوقی کا خاص حصہ ہے۔

انھوں نے قومی ترانے بھی لکھے جنھیں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی، ایک ترانہ کے چند اشعار یہ ہیں :-

الیوم نسود بوادینا　　　ونعید محاسن ماضینا

ویشید العز بایدینا　　　وطن نفدیہ ویفدینا

وطن بالحق نؤیدہ　　　وبعین اللہ نشیدہ

ونحسنہ ونزینہ　　　بمآثرنا ومساعینا

سر التاریخ وعنصرہ　　　وسریر الدھر ومنبرہ

وجنان الخلد وکوثرہ　　　وکفی الآباء ریاحینا

ملک پر اب ہماری سیادت ہوگی اور ہم ماضی کی خوبیوں کو پھر اجاگر کریں گے۔

ہمارے ہاتھوں وطن کی عزت بڑھے گی جس پر ہم اور جو ہم پر فدا ہے،

ہم صحیح طور پر وطن کی مدد کریں گے اور خدا کی مدد سے اسے مضبوط بنائیں گے

اپنے کارناموں اور کوششوں سے اسے مزین و آراستہ کریں گے،

یہ ملک تاریخ کا راز اور اس کا عنصر ہے اور موجودہ دور کے لیے منبر و تخت ہے۔

اس میں جنت و کوثر کی صفت ہے اور ہمارے بزرگ اس کے لیے باعث زینت

(باقی)

ادبیات

تضمین

بر نعت حضرت امیر خسرو رحمہ اللہ

از

جناب منظور علی تمنا بجنوری

(۱) اے شاہکار عالم یزل، اے نازش پیغمبری
شد کلکِ قدرت دستکش بعد تو از صورتگری
ہم خالقِ کونین شد بہرِ جمالت مشتری
اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری
ہر چند وصفت میکنم در حسن زاں بالاتری

(۲) اے نور ذاتِ کبریا قندیلِ قصرِ خسروی
بر فرقِ تو زیبد بجا واللہ تاجِ سروری
والشمس رخِ پاکِ تو، واللیل زلفِ عنبری
اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری
ہر چند وصفت میکنم در حسن زاں بالاتری

(۳) چوں گشت حسنت در جہاں آمادۂ جلوہ گری
گشتہ خجل از حسنِ تو حور و ملک جن و پری
نادہ بحسنت ہیچکس یکسر مجالِ ہمسری
تو از پری چابکتری، و ز برگِ گل نازکتری
وز ہر چہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

(۴) گیسوئے عنبر زلفِ تو، ابروئے خوش ادائے تو
چشمانِ سرمہ سائے تو، صف بستہ مژگانہائے تو
زلفِ حسیناں جائے تو پامال زیرِ پائے تو
عالم ہمہ یغمائے تو، خلقِ خدا شیدائے تو
آں نرگسِ رعنائے تو، آوردہ رسم کافری

(۵) گشتم بگلزارِ جہاں، گلہائے رنگیں چیدہ ام
بہتر ز حسنت دیگرے دیدہ ام نہ شنیدہ ام
بالا ز تو ناید نظر ہم از خدا پرسیدہ ام
آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(۶) چوں در شبِ اسریٰ رسید پایت بعرشِ خسروی
قدرت زخود بر فرقِ تو آراست تاجِ سروری
در بر گرفت وایں صدا آمد ز صوتِ سرمدی
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(۷) دکشید نقاشِ ازل نقشِ تو در عالم دگر
ممکن نہ باشد از بشر توصیفِ مافوق البشر
حقا ثنا خوانِ تو است خلاقِ عالم سر بسر
ہرگز نیاید در نظر صورت ز رویت خوبتر
شمسی ندانم یا قمر یا زہرہ یا مشتری

(۸) اے خسروِ ہر دو جہاں المصطفیٰ والمجتبیٰ
عرضِ تمنا گوش کن محتاجِ کل ارض و سما
للہ یک چشمِ کرم بر حالِ زارم برکشا
خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

(۹) اے رازدارِ کن فکاں محبوبِ ربِ دوسرا
پشت و پناہِ عاصیاں اے شافعِ روزِ جزا
بنہادہ سر بر آستاں گفتہ تمنا بینوا
خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

ہدیۂ سلام

از جناب وارث القادری

قسم خدا کی بعنوانِ فیضِ عام چلا
رسولِ پاکؐ سے انسانیت کا نام چلا

زمیں کا نظم، نہ افلاک کا نظام چلا / بنیران کے کسی کا نہ کوئی کام چلا

یہ سلسلہ مری جانب سے صبح و شام چلا / صبا چلی، کہ مرا ہدیۂ سلام چلا

یہ راہ نور ہے اس پر چلے تو سر کے بل چلے / وہ کیا چلا جو دینے بقید گام چلا

خدا کی ساری خدائی کا پیشوا ہے تو / نظام حق کا ترے زیر اہتمام چلا

میں تیرے نور کے صدقے ظہور کے قرباں / ازل کی صبح چلائی ابد کی شام چلا

ترے ہی عارض نے عطا کی دلوں کو تابانی / تری ہی زلف سے رنگ سواد شام چلا

بفیض عکس تجلی چمک اٹھا خورشید / برنگ نقش کف پا مہ تمام چلا

زمانہ کر کے ترقی خدا سے دور ہوا / اسی قدر یہ گرا جتنا تیز گام چلا

نشیب فرش کا ساکن بحکم رب جلیل / فراز عرش کی جانب بے کلام چلا

وہ شرار بولہبی ہو کہ جہل کی ظلمت / کسی کی کچھ نہ چلی جب ترا پیام چلا

زہے نصیب کہ وارث چلے تو لوگ کہیں
حضور سرور کونین کا غلام چلا

نعت شریف

از جناب تسکین قریشی

فروغ کون و مکاں رازِ عالم آرائی / محمد عربی، سیدی و مولائی

حبیب رب جلیل و جمیل، صلِ علیٰ / تمام مظہر جاہ و جمال و زیبائی

بجز مدینہ کہیں بھی پناہ مل نہ سکی / ہجوم یاس میں سب کو یہیں کی یاد آئی

خدا گواہ کہ محبوبیت کی محفل میں / حبیب پاک ہیں شایان شان یکتائی

گدائے دولت دنیا نہیں گدائے رسول / یہاں کی دین ہو دنیائے دل کی آرائی

ریاض خلد ہے کیا بزم کائنات ہو کیا / اگر ہو یاد مدینہ انیس تنہائی

حریم قدس ادب گاہ عشق ہو تسکیںؔ / قدم قدم پہ ہے لازم یہاں جبیں سائی

مطبوعات جدیدہ

مفتاح القرآن جلد اول و دوم } مرتبہ مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی صفحات ۶۶۷، قیمت ہر جلد ؏ پتہ:۔ مولف سے موضع

رایہ ہنہ برانچ کٹھور، ضلع میرٹھ۔ یو، پی سے ملیگی

اردو میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے اور تفسیریں لکھی جاچکی ہیں، اب مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی مفتاح القرآن کے نام سے ایک نئی تفسیر لکھ رہے ہیں، اس کی دو۲ جلدیں شائع ہوئی ہیں، جو سورۂ فاتحہ و بقرہ کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہیں، مصنف کا مشغلہ درس و تدریس ہے لیکن ان کو تالیف و تصنیف کا ذوق بھی ہے، اور انھوں نے یہ تفسیر بڑی محنت اور غور و فکر سے لکھی ہے، ان کے بعض تفسیری نکات و آرا میں گہرائی اور بصیرت ہے، سورہ کے مضامین کا تجزیہ اور آیات کے نظم و ترتیب کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور نحوی مسائل سے خاص طور پر تعرض کیا گیا ہے، مگر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا کام بڑی احتیاط، پختگی اور ذمہ داری کا ہے، مشہور تفسیری اقوال سے انحراف کے لیے وسیع علم و نظر، قرآن میں گہری بصیرت، عربیت کا عمدہ ذوق اور دین کی صحیح مزاج شناسی نہایت ضروری ہے، مصنف کے تفردات اور شاذ آرا محض جدت پر مبنی ہیں، ان کے اس قسم کے بہت سے خیالات لائق بحث ہیں، خصوصاً جن مقامات میں انھوں نے جمہور مفسرین سے اختلاف اور اپنے نقطۂ نظر کی صحت پر اصرار کیا ہے، ان کی رائیں زیادہ محل نظر ہیں، مثلاً انسان کو خلیفۃ اللہ نہ ماننا، بیت المقدس کو ابتداءً مسلمانوں کا قبلہ نہ تسلیم کرنا، "اضربوہ ببعضھا"

میں "تبعض" کے معنی کا تنا لینا، ملکین (ہاروت و ماروت) کو انسان اور جادوگر قرار دینا وغیرہ، ترجمہ میں بھی کہیں کہیں بے احتیاطی ہوگئی ہے، اور بعض صحیح و ثابت حدیثوں کو ضعیف اور ساقط الاعتبار قرار دیا گیا ہے، طرزِ تحریر، طریقۂ تصنیف اور اندازِ ترتیب بھی قابلِ اصلاح ہے، متن، ترجمہ اور تفسیر ایک دوسرے سے خلط ملط ہوگئے ہیں، دوسرے مترجمین و مفسرین کی تردید میں تفسیر کے بجائے جدل و مناظرہ کا رنگ آگیا ہے، تحریر میں جاذبیت و دل آویزی کی کمی اور خشکی ہے، ان خامیوں کے باوجود یہ تفسیر بعض حیثیتوں سے مفید اور معلومات افزا ہے۔

معارف الحدیث جلد پنجم۔ مرتبہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد ۵ روپے، غیر مجلد ۴ روپے ۵۰ پیسے
پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مولانا محمد منظور نعمانی نے معارف الحدیث کے نام سے منتخب حدیثوں کی جمع و ترتیب اور ان کے ترجمہ و تشریح کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس کی چار جلدیں پہلے چھپ کر مقبول ہوچکی ہیں، اور ان پر معارف میں تبصرہ بھی ہوچکا ہے، یہ پانچویں جلد اذکار و ادعیہ سے متعلق حدیثوں کا مجموعہ ہے، اس میں ذکر اللہ، تلاوت قرآن، دعا و استعاذہ، استغفار و توبہ اور صلوٰۃ و سلام علی النبی کے زیر عنوان ان ابواب کی حدیثیں جمع کرکے ان کی اہمیت، انکے فضائل و برکات آداب و شرائط اور رسول اللہ سے ان کے بارہ میں منقول الفاظ و کلمات کی برکت و تاثیر بیان کی گئی ہے، فاضل مولف نے احادیث کا بڑا معنی خیز اور شستہ ترجمہ اور ان کی نہایت دلنشین اور موثر تشریح کی ہے، اور ان کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا تشفی بخش جواب بھی دیا ہے، ہر عنوان سے پہلے تمہید میں اس کی حقیقت و اہمیت اور غرض و حکمت تحریر کی گئی ہے، یہ پورا سلسلہ بہت مفید ہے، یہ حصہ اذکار و ادعیہ پر مشتمل ہے، اس لیے اس میں قلبی سکون و طمانیت کا بڑا سامان ہے،

مولانا کی موثر تحریر نے اس کو اور زیادہ دلنشین بنا دیا ہے، اور وہ ہر صاحبِ دل مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

امتِ مسلمہ کا نصب العین۔ مرتبہ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۲ قیمت ۲ روپے، پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

اس کتاب میں اقامتِ دین کی اہمیت اور اس کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس کو مسلمانوں کا مقصد اور نصب العین ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں لائق مصنف نے انبیاء کی بعثت و دعوت، وعدۂ نصرت، انسان کی خلافت و نیابت الٰہی، شہادت علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مفصل ذکر کرکے دکھایا ہے کہ ان سب کی غرض و غایت دین کی اقامت و اظہار ہے، ضمناً اقامت دین کے متعلق بعض شبہات و اعتراضات کا مفصل جواب بھی دیا ہے، یہ کتاب جواباً لکھی گئی ہے، اس لیے تحریر میں مناظرانہ رنگ اور لہجہ کی تیزی آگئی ہے، مگر اصل مباحث کا مدار کتاب و سنت اور مستند علماء و مفسرین کے اقوال پر ہے، اور اکثر بحثیں علمی حیثیت سے بھی مفید اور دلچسپ ہیں۔

فہرست عربی مخطوطات رضا لائبریری رامپور (انگریزی) مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی صاحب، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۳۰، مجلد، قیمت ۳۰ روپے، ناشر رضا لائبریری ٹرسٹ رامپور، یوپی

یہ رضا لائبریری رامپور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی تیسری جلد ہے، جو گورنمنٹ آف انڈیا کی سرپرستی میں اہتمام سے انگریزی میں شائع کی گئی ہے، اور فقہ اور اصول فقہ، فرائض، مناظرہ اور جدل و خلاف کے تقریباً ایک ہزار مخطوطات کا اس میں ذکر ہے، فنون

کی علٰحدہ تقسیم کے علاوہ فقہ، اصول فقہ اور علم الفرائض میں چاروں مشہور فقہی مذاہب اور اثنا عشری، زیدیہ، شیعہ اور خوارج کی کتابوں کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر ہے، فاضل مرتب نے تصنیف، مصنف اور شارح کا نام، ان کے سنین وفات، مخطوطہ کے زمانہ، شان خط، سائز، صفحات اور سطروں کی تعداد، اس کے کامل و ناقص ہونے کی تصریح اور اہم خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، مصنف کا نام اس کی خوبی کی پوری ضمانت ہے، اس فہرست میں بعض نہایت اہم، قدیم اور نایاب مخطوطات بھی شامل ہیں، اس کی اشاعت سے علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

<table dir="rtl">
<tr><td>مفتاح الکنوز (فہرست عربی مخطوطات) جلد ثالث</td><td rowspan="3">بڑی تقطیع، کتابت وطباعت اچھی صفحات بالترتیب ۲۰۸ و ۲۹۵ غیر مجلد و ۲۹۰ مجلد قیمت درج نہیں، پتہ خدابخش خان اورینٹل</td></tr>
<tr><td>مرآۃ العلوم فہرست فارسی مخطوطات جلد سوم</td></tr>
<tr><td>فہرست مخطوطات اردو خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ</td></tr>
</table>

پبلک لائبریری، پٹنہ۔

خدابخش خان لائبریری پٹنہ کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرستوں کی دو دو جلدیں عرصہ ہوا شائع ہوئی تھیں، اب ان کی تیسری جلد سید اطہر شیر صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے مرتب کر کے شائع کی ہے، لائبریری کے اردو مخطوطات کی کوئی باقاعدہ فہرست شائع نہیں کی گئی تھی، اسے عابد امام زیدی صاحب لائبریری اسسٹنٹ نے ان کی پہلی جلد شائع کی ہے، عربی و فارسی مخطوطات کی موجودہ تیسری جلد کی ترتیب سابق جلدوں کے مطابق ہے، یعنی فن وار کتابوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر ذکر کرنے کے بعد ان کے مصنفین، کاتبوں کے نام، سنہ کتابت، رسم الخط، اوراق و سطور کی تعداد، سائز اور بعض اہم خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے، اردو فہرست میں بھی ان امور کا ذکر ہے، لیکن اس کی ترتیب کتابوں کے بجائے مصنفین کے ناموں پر ہے، عربی فہرست کے دیباچہ میں الحاوی فی علم التداوی کو الہادی اور اردو کے دیباچہ میں خطبہ مسنونہ غلط لکھا گیا ہے، ان فہرستوں کی ترتیب و اشاعت پر مرتبین اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

داستانِ چند۔ مرتبہ جناب راز چاندپوری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۲۸ قیمت ۶۰ پتہ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

جناب راز چاندپوری اردو کے نامور شاعر سیماب اکبرآبادی مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں ہیں، ان کی سیماب صاحب سے برابر خط وکتابت رہتی تھی، اور وہ برسوں آگرہ میں انکے ساتھ رہے بھی تھے، اس لیے سیماب صاحب کے متعلق ان کے پاس بہت سے خطوط و رسائل اور مختلف یادداشتیں محفوظ تھیں، اس کتابچہ میں انھوں نے انہی ان معلومات اور یادداشتوں کی مدد سے سیماب مرحوم کی شخصیت، زندگی، سوانح اور خدماتِ شعر و ادب کی یہ داستان مرتب کی ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ اور ادبی حیثیت سے مفید ہے، لائق مصنف خود بھی اردو زبان کے پختہ مشق شاعر و ادیب ہیں، اس لیے زبان بہت منجھی ہوئی اور تحریر بڑی شگفتہ اور دلاویز ہے۔

مقالاتِ یوم شبلی۔ مرتبہ حافظ نذر احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶ قیمت ۵۰ پیسے۔ پتہ مرتب مسلم اکیڈمی، ۱۸ محمد نگر، لاہور۔ ملیگی

علامہ شبلی مرحوم کے بعض پاکستانی عقیدتمندوں نے ان کے نام سے لاہور میں ایک شبلی کالج قائم کیا ہے، اس کے طلبا کی "بزم ادب" نے مئی ۱۹۶۵ء میں "یوم شبلی" کی تقریب دھوم دھام سے منائی تھی، اس میں مولانا کی شخصیت، ان کے کمالات اور خدمات کے بعض پہلوؤں پر مقالات پڑھے گئے تھے، اور ان کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا، کالج کے لائق پرنسپل حافظ نذر احمد صاحب نے ان سب کا مجموعہ شائع کر دیا ہے، یہ مضامین ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود مفید اور طلبہ کو مولانا کی شخصیت اور کارناموں سے روشناس کرانے کے لیے کافی ہیں، اس تقریب کے فاضل صدر ڈاکٹر سید عبد اللہ کا خطبہ مختصر ہونے کے باوجود پرمغز اور جامع ہے، اس میں پاکستان کے ان ناشرین کا ذکر خیر بھی ہے جو مولانا کی تصنیفات ناجائز طور پر غلط سلط چھاپ رہے ہیں، دو مضامین میں دار المصنفین اور

ندوۃ العلماء کے متعلق مولانا کا تخیل اور ان کی ضرورت و اہمیت دکھائی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے سب مضامین مفید اور دلچسپ ہیں، شروع میں مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی ایک غزل اور غیر مطبوعہ خط کا عکس بھی دیا گیا ہے، جو تقریب کے بانیوں کی درخواست پر دار المصنفین سے بھیجا گیا تھا۔

صحرا صحرا - مرتبہ جناب کبیر احمد صاحب صبا جائسی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۲۷، قیمت عہ مجلد ۳ پتہ کتاب گھر، علی گڑھ۔

جناب کبیر احمد صبا جائسی ایک ہونہار ادیب و شاعر ہیں، اُن میں شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، "صحرا صحرا" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، مصنف شعر و سخن کے موجودہ ترقی پسندانہ رجحان سے واقف ہیں، لیکن انھوں نے روایتی شاعری سے اپنا تعلق باقی رکھا ہے، انکے جذبات میں بلندی اور خیالات میں پاکیزگی ہے، ان کا صحرا میں آبلہ پائی کا شوق انتہائی میں دامن تر اور گرد سفر کا سہارا اور شورش و یلغار میں آگے بڑھنے کا حوصلہ قابل داد ہے، یہ صبا صاحب کا پہلا مجموعہ ہے، اس لیے ابھی ان کے بعض اشعار میں ابہام و تعقید ہے، نیز بعض الفاظ و ترکیبوں میں سلاست و روانی کی کمی بھی ہے، وہ اصلاً فارسی ادبیات کے طالب علم ہیں، اس مجموعہ کے آخر میں چار پانچ فارسی غزلیں بھی ہیں،

مبادی الصرف - مرتبہ مولانا اقبال عثمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۴۵، قیمت درج نہیں، پتہ دار المعارف، دیوبند،

مصنف نے مبتدیوں کی عربی تعلیم کے لیے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتابچہ اس کا پہلا حصہ ہے، اس میں بہترین پیرایہ اور اچھے انداز میں صرفی مسائل تحریر کیے گئے ہیں، اردو میں صرف و نحو کی جو مفید کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ بھی ان میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

"ض"

نمبر ۱۰۵ - ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۰ء - عدد ۶

مضامین